الدین الحنیف ۔ مترجمہ و مرتبہ مولوی حماد احمد صدیقی، نانوتوی، تقطیع متوسط، کاغذ بہتر، کتابت و طباعت غنیمت، صفحات ۲۰۰، مجلد قیمت ۱۵ روپے، پتہ سنگم کتاب گھر اردو بازار، جامع مسجد دہلی ۶۔

اردو میں احادیث نبوی کے متعدد مجموعے شائع ہو چکے ہیں، اس نئے مجموعہ میں بارہ سو سے زیادہ حدیثوں کا متن مع ترجمہ شائع کیا گیا ہے، صحاح سے ماخوذ ہونے کی بنا پر اس کی حدیثیں مستند ہیں، اور یہ عقائد، عبادات، احکام، اخلاق، آداب اور ادعیہ وغیرہ سے متعلق ہیں، احکام و مسائل کی حدیثوں کے اخذ و انتخاب میں حنفی مسلک کو مد نظر رکھا گیا ہے، ترجمہ بڑی حد تک سلیس ہے، لائق مرتب نے بعض مشکل لفظوں اور کہیں کہیں روایتوں کے دقیق حصوں کی مختصر وضاحت بھی کی ہے، اگر وہ تشریح کی جانب مزید توجہ کرتے تو یہ مجموعہ اور مفید ہوتا، زندگی کے مختلف شعبوں سے متعلق روایات و احادیث کے اس مستند ذخیرہ کی ترتیب و اشاعت ایک مفید دینی خدمت ہے، امید ہے کہ مترجم کی یہ خدمت ہر طرح مفید ثابت ہوگی۔

فارم ۱۷

دیکھو رول نمبر ۸

معارف پریس اعظم گڈھ

نام مقام اشاعت :-	دار المصنفین اعظم گڈھ
نوعیت اشاعت :-	ماہانہ
نام پرنٹر :-	سید اقبال احمد
قومیت :-	ہندوستانی
پتہ :-	دار المصنفین اعظم گڈھ
نام پبلشر :-	" " "
قومیت :-	ہندوستانی
پتہ :-	دار المصنفین اعظم گڈھ
اڈیٹر :-	شاہ معین الدین احمد ندوی
قومیت :-	ہندوستانی
پتہ :-	دار المصنفین اعظم گڈھ
نام و پتہ مالک رسالہ	

میں سید اقبال احمد تصدیق کرتا ہوں کہ جو معلومات اوپر دی گئی ہیں وہ میرے علم و یقین میں صحیح ہیں۔ سید اقبال احمد

جلد ۱۱۴ ماہ ربیع الاول ۱۳۹۴ھ مطابق ماہ اپریل ۱۹۷۴ء جلد ۴

مضامین

شذرات

ہندوستان، پاکستان اور بنگلہ دیش کی مشترکہ کانفرنس پر نہ صرف ہندوستان بلکہ پوری دنیا کی نظریں لگی ہوئی تھیں، ہندوستان کے مسلمان خاص طور پر اسکی کامیابی کے دل سے متمنی اور بے چینی سے اس کے نتیجے کے منتظر تھے، خدا کا شکر ہے کہ کانفرنس کامیاب رہی اور پاکستان و بنگلہ دیش کے درمیان جو فوری تصفیہ طلب مسائل تھے، اور جن پر آیندہ مستقل اور پائیدار امن و صلح کا دارومدار تھا، خوش اسلوبی سے طے ہو گئے، اور اس راہ کا سب سے بڑا پتھر ہٹ گیا، اگرچہ ابھی بہت سے مسائل کا تصفیہ باقی ہے، اگر اسی جذبۂ مصالحت سے کام لیا گیا تو وہ بھی طے ہو جائیں گے،

ہندوستان، پاکستان اور بنگلہ دیش کے درمیان جنگ و صلح کے سیاسی پہلو بھی ہیں اور انسانی پہلو بھی، سیاسی پہلو یہ ہے کہ یہ تینوں ملک ایک ہی ملک کے کٹے ہوئے ٹکڑے ہیں، اس لئے جغرافی، سیاسی اور اقتصادی حیثیت سے ایک دوسرے کے ساتھ اتنے وابستہ ہیں کہ وہ مل ہی کر ترقی کر سکتے ہیں، اختلاف میں ان کو امن و سکون حاصل نہیں ہو سکتا اور وہ ملک کی تعمیر و ترقی کی طرف پوری توجہ نہیں کر سکتے، اس لیے اگر وہ امن و سکون چاہتے ہیں تو ان کے لیے مصالحت کے سوا کوئی راہ نہیں ہے،

انسانی پہلو یہ ہے کہ ہندوستان کے مسلمانوں کے ہزاروں خاندان ہندوستان اور پاکستان کے درمیان تقسیم ہیں، باپ ہندوستان میں ہے تو بیٹا پاکستان میں، بیٹی پاکستان میں ہے تو ماں ہندوستان میں،

کوئی خاندان مشکل ہی سے ایسا نکل سکتا ہے جس کا کوئی نہ کوئی فرد پاکستان میں نہ ہو، یہ کتنی بڑی بے دردی ہے کہ وہ ایک دوسرے سے مل نہیں سکتے، خط و کتابت نہیں کر سکتے بلکہ موت میں بھی شریک نہیں ہو سکتے، بوڑھے ماں باپ اولاد کی صورت دیکھنے کو ترستے ہیں، اگر پاکستان کے کچھ باشندے ہندوستان میں اور ہندوستان کے پاکستان میں ہوتے تو انکو اس درد کا احساس ہوتا، یہ کتنی افسوسناک بات ہے کہ ہندوستان و پاکستان کے باشندے امریکہ اور یورپ تو آسانی سے آجا سکتے ہیں لیکن اتنے قریب ہو کر ایک دوسرے کی صورت نہیں دیکھ سکتے، اس مصالحت سے امید بندھی ہے کہ شاید دونوں ملکوں میں آمد و رفت کی سہولتیں بھی جلد پیدا ہو جائیں، خدا کرے باقی امور بھی جلد طے پا جائیں اور تینوں ملکوں کو اطمینان کا سانس لینے کا موقع ملے۔

حکومت ہند مرزا غالب کی طرح امیر خسرو اور ڈاکٹر اقبال کی یادگار بھی منا رہی ہے اور اس کے انتظامات شروع ہو گئے ہیں، یہ دونوں اپنے عہد کے عبقری اور ہندوستان کے لیے باعث فخر ہیں، ایسی شخصیتیں مدتوں میں پیدا ہوتی ہیں، امیر خسرو میں اتنے گوناگوں کمالات جمع تھے کہ مشکل ہی سے ایک انسان میں جمع ہوتے ہیں، اردو میں سب سے پہلے علامہ شبلی نے خسرو کی شاعری کی اہمیت واضح کی، ہمارے رفیق کار سید صباح الدین عبد الرحمن صاحب نے خسرو کی شاعری کے ہندوستانی عناصر پر ایک مستقل کتاب "ہندوستان امیر خسرو کی نظر میں" لکھی اور گذشتہ مہینہ جواہر لال یونیورسٹی دہلی میں ان کی عبقریت پر مقالہ پڑھا۔

اقبال کے جیسا فلسفی اور مفکر مسلمانوں میں صدیوں کے بعد پیدا ہوا، جس نے اپنی شاعری سے بانگ درا کا بھی کام لیا اور ضرب کلیم کا بھی، ان کی شاعری پورے مشرق کے لیے پیام بیداری ہے، مگر انھوں نے مسلمانوں کو زیادہ مخاطب کیا، اور ان کی تجدید و اصلاح کے لیے ان میں

مذہبی روح پھونکنے کی کوشش کی ہے، اس لیے ایک طبقہ جس کی نظر ان کے پورے کلام پر نہیں ہے، ان کو فرقہ پرور اور صرف مسلمانوں کا شاعر سمجھتا ہے، جو خود اس کا تصور نظر ہے ورنہ حقیقت یہ ہے کہ ان کے کلام میں نہ صرف مسلمانوں بلکہ ہندوستان اور پورے ایشیا کے لیے زندگی کا پیام ہے، وہ عالم انسانیت کے ہوا خواہ تھے، ان کے کلام میں ان سے متعلق بڑی موثر نظمیں ہیں، ایشیا کو مخاطب کرکے تو انھوں نے ایک مستقل مثنوی لکھی ہے، مسلمانوں کو اس لیے زیادہ مخاطب کیا ہے کہ وہ اپنی پستی اور زبوں حالی کی بنا پر زیادہ توجہ کے مستحق تھے، ان کے کلام میں افکار و حقایق کا ایک عالم ہے، اس کو سمجھنے کے لیے ان کے پورے کلام پر نظر ضروری ہے، ورنہ اندھوں اور ہاتھی کا معاملہ ہوگا، راقم نے عرصہ ہوا ان کی فرقہ پروری کی تردید میں معارف میں ایک مفصل مضمون لکھا تھا، اور ان کی اسلامی شاعری پر دار العلوم ندوۃ العلماء میں ایک مقالہ پڑھا تھا جو معارف میں چھپ گیا، دار المصنفین نے ان پر ایک جامع کتاب "اقبال کامل" شائع کی ہے۔

ان کی فرقہ پروری کے الزام کو سب سے زیادہ ان کے معنوی شاگرد اور ان کے کلام کے ممتاز شارح و مبصر جگن ناتھ آزاد نے دور کیا، اور ان کی شاعری کے مختلف پہلوؤں پر بڑے قابل قدر مضامین لکھے، اقبال کے جیسے آفاقی شاعر کسی ملک اور قوم کی ملک نہیں ہوتے، ان پر سب کا مساوی حق ہوتا ہے، اور اقبال تو متحدہ ہندوستان کی پیداوار ہیں، اور ان کا کلام اس کی محبت سے معمور ہے، اس لیے ہندوستان کا ان کی یادگار منانا اس کی فرض شناسی کا ثبوت ہے، ہم اس کا خیر مقدم کرتے ہیں۔

مقالات

سفر حج کی مختصر روداد

راقم سطور نے ۱۹۶۶ء میں فریضہ حج ادا کیا تھا، پہلے حج میں فریضہ تو ادا ہو جاتا ہے لیکن اس سے سیری نہیں ہوتی اور دوسرے حج کی تمنا باقی رہتی ہے اور ایک حج کا تجربہ ہو چکا ہوتا ہے اس لئے دوسرے حج میں زیادہ سہولت ہوتی ہے، اس لئے راقم کے دل میں بھی دوسرے حج کی تمنا تھی، اس کا سامان اللہ تعالے نے اس طرح فرما دیا کہ سعودی حکومت ہر سال مختلف ملکوں سے کچھ لوگوں کو بطور شاہد اپنے خرچ پر حج کیلئے مدعو کرتی ہے، گذشتہ حج کیلئے ہندوستان سے مولانا سید ابو الحسن علی ندوی نے میرا، مولانا عبد الماجد صاحب دریابادی اور مولانا عبد السلام قدوائی کا نام پیش کر دیا، اور ہم لوگوں کے پاس آخر اکتوبر میں دعوت نامہ آگیا، مولانا عبد الماجد صاحب بہت ضعیف ہو گئے ہیں، بینائی میں بھی فرق آگیا ہے، اس لئے کسی مددگار کے بغیر اتنا لمبا سفر تنہا نہیں کر سکتے، ہم لوگ خود پیری کی منزل میں ہیں، مولانا کو ایک جوان اور قوی "مددگار کی ضرورت تھی، اس کی کوشش کی گئی، مگر حج کا زمانہ قریب آگیا، اور کوئی نتیجہ نہیں نکلا اس لئے مولانا سفر نہ کر سکے اور صرف راقم اور مولانا عبد السلام صاحب باقی رہ گئے، اور حج کے شرف سے مشرف ہوئے۔

حج کے سفر نامے آئے دن لکھے جاتے ہیں، ان میں کوئی ندرت باقی نہیں رہ گئی ہے۔ راقم نے بھی پہلے حج کا مختصر سفر نامہ لکھا تھا، جو معارف میں شائع ہوا تھا، اس لئے اس مرتبہ

مطلق اس کا ارادہ نہ تھا، اور اسی لیے اس کی کوئی یادداشت بھی
نہیں لکھی تھی، مگر معارف کے بعض ناظرین کا تقاضا ہوا کہ انکو بھی اس سفر کی بھی کچھ نہ کچھ سوغات
ملنی چاہیے، ہمارے رفیق۔۔ سفر مولانا عبدالسلام صاحب کا بھی اصرار ہوا، اس لئے ان سب کی
کی فرمایش پوری کرنی پڑی، مگر اصطلاحی معنوں میں یہ کوئی سفرنامہ نہیں ہے، بلکہ اس سفر کے
جو قابلِ ذکر واقعات دماغ میں محفوظ رہ گئے ہیں اور مختلف چیزوں کے متعلق جو تاثرات دل میں
پیدا ہوئے ان کو مختصراً پیش کیا جائے گا، ناظرین بھی اسی نقطۂ نظر سے اس کو ملاحظہ فرمائیں،

ہم لوگ سعودی حکومت کی دعوت پر جا رہے تھے، عام حاجیوں کے سفر سے ہمارا تعلق
نہ تھا، اس لئے حجاج کے پاسپورٹ کے بجائے انٹرنیشنل پاسپورٹ بنوانا پڑا اور انڈین ایرلائن
کے بجائے سعودی ایرلائن سے ہمارا سفر ہوا، لکھنؤ میں پاسپورٹ وغیرہ کے جو کام تھے، عزیزان
ندوہ نے انجام دیئے، اور دلی کے کام مولانا عبدالسلام صاحب ندوائی نے جن کا قیام دلی میں
تھا، ۲۲ دسمبر کے ہوائی جہاز سے ہمارے ٹکٹ تھے، اس سے تین چار دن پہلے ہم کو بمبئی پہنچنا
تھا، مولانا عبدالسلام صاحب نے ۱۶ دسمبر کی ٹرین سے بمبئی کے لیے سیٹیں بک کرا لی تھیں،
اس لئے راقم ۱۳ کو لکھنؤ سے چل کر ۱۴ کو دلی پہنچا، اتفاق سے ۱۶ دسمبر کو جس دن بمبئی کا
سفر تھا ریلوے اسٹرائک ہو گئی، جس ٹرین سے ہم کو جانا تھا وہ بند نہیں ہوئی تھی، لیکن
اندیشہ تھا کہ آگے چل کر معلوم نہیں کیا صورت پیش آئے، اور ۲۲ سے دو تین دن پہلے
ہمارا بمبئی پہنچنا ضروری تھا، اس لیے احباب جامعہ کی رائے ہوئی کہ ٹرین سے جانا خطرہ
سے خالی نہیں ہے، ہوائی جہاز سے جانا چاہیے، اتنی جلد ہوائی جہاز کا ٹکٹ ملنا مشکل تھا،
لیکن اتفاق سے دوسرے ہی دن کے لیے ٹکٹ مل گیا، ٹرین کا رزرویشن بھی آسانی سے
منسوخ ہو گیا، ہمارا جہاز ۲۲ دسمبر ۹ بجے دن کو جانے والا تھا، ہم لوگ دو تین گھنٹے پہلے

ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب کی کار پر ہوائی اڈے پہنچ گئے، جس جہاز سے ہم کو جانا تھا وہ کئی
گھنٹے لیٹ تھا ۹ بجے دن کے بجائے ۴ بجے سہ پہر کو روانہ ہوا، اور ۶ بجے شام کو بمبئی پہنچا، اپنے میزبان
منشی عبدالعزیز صاحب انصاری کو دلی سے تار دیدیا تھا، وہ ٹرین سے ہماری آمد کے منتظر
تھے، اور ہم کو لینے کے لیے اسٹیشن جانے کی تیاری کر رہے تھے کہ ہم لوگ پہنچ گئے، ان کے
دولت کدہ پر قیام ہوا، انصاری صاحب کا گھر مستقل مہمان خانہ ہے کوئی دن بھی مہمانوں
سے خالی نہیں رہتا، ان میں سے بعض بعض مہینوں اور بعض مستقل رہتے ہیں، اور وہ بڑی
فیاضی اور سیر چشمی سے سب کی میزبانی کرتے ہیں، اور کھلا کر خوش ہوتے ہیں، اس زمانہ میں
ایسی مثالیں کم ملتی ہیں، بمبئی میں تین چار دن سفر کی ضروری کارروائیوں اور احباب سے
ملنے ملانے میں گذرے، ایک دن ہمارے کرمفرما عبدالرزاق صاحب قریشی نے انجمن
اسلام کے دفتر میں چائے پر بلایا، یہاں ضیاء الحسن صاحب پرنسپل، مولانا شہاب مالیر
کوٹلوی اور انجمن کے دوسرے اصحاب سے ملاقات ہوئی، شہاب صاحب دیسنوی کئی مرتبہ
قیام گاہ پر ملنے کے لیے آئے۔ حکیم مختار احمد صاحب اصلاحی نے بہت سی دوائیں ساتھ
کر دیں۔

۲۲ کو ہوائی اڈے پہنچے، منشی عبدالعزیز صاحب ان کے صاحبزادے ابو صالح
اور خورشید سلمہ، اسٹیشن تک رخصت کرنے آئے، اتفاق سے اس دن بھی جہاز کئی گھنٹے
لیٹ تھا، اور مقررہ وقت سے کئی گھنٹے بعد بمبئی سے روانہ ہوا، اور کراچی، ظہران اور ریاض
ہوتا ہوا، ایک بجے رات کے بجائے ۴ بجے صبح جدہ پہنچا، ظہران میں پاسپورٹ اور سامان
وغیرہ کی جانچ میں کئی گھنٹے رکنا پڑا، جدہ میں جو سرکاری آدمی اور احباب ہم لوگوں
کو لینے کے لئے آئے تھے وہ کئی گھنٹے انتظار کرنے کے بعد ہوائی اسٹیشن کے عملہ کو ہم لوگوں کی

امداد اور رہنمائی کی ہدایت کر کے لوٹ گئے اس لئے جب ہم لوگ جدہ پہنچے تو کوئی
شناسا اور سرکاری آدمی نظر نہ آیا، ہوائی اسٹیشن کا عملہ ناتجربہ کاری کی وجہ سے ہماری
کوئی مدد نہ کرسکا اور ہم لوگ کئی گھنٹے سرگرداں رہنے کے بعد ہندوستانی سفارت خانے
پہنچے، اتفاق سے اس کے فرسٹ سکریٹری اور افسر حج خالد صاحب مولانا عبدالحلیم صدیقی
ملیح آبادی مرحوم کے لڑکے اور مولانا عبدالسلام صاحب کے شاگرد تھے، انھوں نے ہر طرح کی
مدد کی، ہندوستانی سفیر ظہیر صاحب سے ملایا، اور سعودی وزارت خارجہ سے ربط
پیدا کرکے ہم لوگوں کے آنے کی اطلاع دی، اس کے تھوڑی ہی دیر کے بعد وزارت
اعلام کے عہدہ دار رشاد عبداللہ جو ہماری رہنمائی اور دیکھ بھال کے لیے متعین کے گیے
تھے آگئے اور بڑی معذرت کی انھوں نے بتایا کہ وہ رات کو ہمارے استقبال کے لئے
گئے تھے، مگر ہوائی جہاز لیٹ زیادہ تھا، اس لئے ہوائی اسٹیشن کے متعلقہ عملہ کو ہماری پذیرائی
اور ہوٹل تک ہم کو پہنچانے کی ہدایت کرکے لوٹ آئے تھے، مگر عملہ کی نااہلی، یا وزارت خارجہ
کی دفتری غفلت کی وجہ سے اس پر عمل نہ ہوسکا، اور شام کے وقت ہم دونوں کو جدہ
کے شاندار ہوٹل فندق قصر الکندرہ میں لے گیے، عبداللہ عباس صاحب ندوی کو بھی فون
کے ذریعہ مکہ معظمہ ہماری آمد کی اطلاع دیدی گئی تھی، اس لئے رات ہی کو وہ جدہ پہنچ
گئے، انھوں نے بتایا کہ وہ بھی ہوائی اسٹیشن گئے تھے، مگر ہوائی جہاز لیٹ زیادہ تھا،
اس لئے وہ بھی رشاد عبداللہ کے ساتھ لوٹ آئے تھے، رات ہوٹل میں بسر کی صبح
ناشتہ کے بعد رشاد عبداللہ صاحب کے ساتھ مکہ روانہ ہوئے، فندق مکہ میں جہاں
ہمارے قیام کا پہلے سے انتظام تھا ٹھہرایا، یہ ہوٹل حرم شریف کے بالکل متصل ہے،
درمیان میں صرف سڑک ہے،

ہم لوگ ۲۴ دسمبر کو مکہ معظمہ پہنچے تھے، حج کو صرف ایک ہفتہ باقی رہ گیا تھا،
اور حجاج کا اتنا ہجوم تھا کہ حرم شریف میں غیر معمولی وسعت کے باوجود نماز کے اوقات میں
تل دھرنے کو جگہ نہ رہ جاتی تھی، نماز باہر سڑکوں اور گلیوں تک میں ہوتی تھی، اگر بہت پہلے
سے نہ جایا جائے تو حرم کے اندر جگہ نہیں مل سکتی تھی، اس ازدحام میں کمزور آدمیوں
کے لیے طواف کرنا اور بھی مشکل تھا، اگرچہ خانہ کعبہ کے دروازے کی سمت میں مقام ابراہیم
کا گنبد ہٹ جانے کی وجہ سے پہلے کے مقابلہ میں وسعت پیدا ہو گئی ہے، اسکے باوجود اس سمت میں
اتنا ہجوم ہوتا ہے کہ حجر اسود کا بوسہ لینا ہم جیسے کمزوروں کے لئے ناممکن ہو جاتا ہے، مگر کسی نہ کسی
طرح عمرہ کے مناسک ادا کئے، اس کی تفصیل بعد میں آئے گی۔

البتہ اب سعی میں بڑی سہولت ہو گئی ہے، پہلے صفا اور مروہ کے درمیان سڑک
اور اس کے دونوں جانب دکانیں تھیں، حاجیوں کو اور سڑک پر لوگوں اور سواریوں کے
ہجوم میں سعی کرنا پڑتی تھی، اب حکومت نے دکانیں ہٹوا کر صفا اور مروہ کے درمیان
ایک عظیم الشان وسیع اور خوبصورت ہال تعمیر کرادیا ہے۔ آمد و رفت کی سہولت
کے لیے اس کے طول میں ریلنگ دیدی ہے، ایک طرف سے حاجی جاتے ہیں اور
دوسری طرف سے آتے ہیں، اس ہال کا طول ایک فرلانگ سے کم نہ ہوگا، عرض اتنا ہی
کہ بیک وقت سیکڑوں آدمی آسانی سے آجا سکتے ہیں اور حجاج برقی پنکھوں کی ہوا میں
سہولت سے سعی کرتے ہیں، صفا کے اوپر ایک عظیم الشان خوشنما گنبد ہے جس سے اسکی شان
اور عظمت اور بڑھ گئی ہے،

ہم لوگوں نے تمتع کی نیت کی تھی، اس لئے عمرہ کرکے احرام کھول دیا تھا، پھر
آٹھویں ذی الحجہ کو احرام باندھکر منیٰ روانہ ہوئے، یہاں ایک وسیع سرکاری عمارتیں

قیام کا انتظام تھا، جس میں دوسرے ملکوں کے وفود بھی ٹھہرائے گئے تھے، نویں کی صبح کو عرفات روانہ ہوئے، یہاں آرام دہ خیموں کا انتظام تھا، عرفات میں ظہر اور عصر کی نماز کے بعد کا وقت تسبیح و تہلیل اور ادعیہ ماثورہ کے ورد میں گذرا، ملتزم شریف سے لپٹنے کی لذت کے بعد کا یہ دوسرا موقع تھا کہ دل کو کیفیت محسوس ہوئی، غروب آفتاب کے بعد مزدلفہ روانہ ہوئے، یہاں پہنچکر مغرب و عشا کی نمازیں باجماعت ادا کیں اور حسب توفیق دعاؤں کا بھی ورد رہا، اگرچہ مزدلفہ میں صرف ایک رات رہنا تھا۔ لیکن یہاں بھی آرام و آسائش کا پورا انتظام تھا، صبح کو پھر منیٰ روانہ ہوئے، اور ۱۰ ذلحجہ کو سب سے پہلے رمی سے فراغت حاصل کی، اس کے بعد قربانی کا مرحلہ تھا، مذبح کے ہولناک حالات سنکر خود جاکر قربانی کرنے کی ہمت نہیں پڑی، اور یہ کام مولانا عبد الماجد صاحب ندوی سابق ادیب دار العلوم ندوۃ العلماء (جواب جدہ ریڈیو اسٹیشن میں ملازم ہو گئے ہیں) اور بستی کے مدینہ یونیورسٹی کے دو نوجوان طالب علموں کے سپرد کیا، انھوں نے ۱۰ ہی کو قربانی کردی تھی، اور اس کی اطلاع بھی دینے کے لیے آئے تھے، لیکن ان سے ملاقات نہ ہوسکی اور ہم لوگوں نے اس شبہ میں کہ ممکن ہے ۱۰ کو قربانی نہ ہوسکی ہو احرام نہیں کھولا، ۱۱ ذلحجہ کی سہ پہر کو قربانی کی اطلاع ہوسکی، اس وقت احرام کھولا اس دن دوسری رمی سے فارغ ہوئے اس کے بعد آدھی رات کو طواف زیارت کے لیے مکہ گئے، اس سے فراغت کے بعد منیٰ واپس آئے، اور رات گذار کر ۱۲ اکتو کو تیسری مرتبہ رمی جمار کر کے مکہ گئے، رمی جمار حج کا سب سے مشکل کام ہے، اس کی تفصیل بعد میں آئے گی۔

مکہ معظمہ کے قیام کے قابل ذکر واقعات

مکہ معظمہ کے قیام کے زمانہ میں دو مرتبہ مولانا محمد سلیم صاحب ناظم مدرسہ صولتیہ کی خدمت میں حاضری ہوئی، موصوف حسب معمول بڑی شفقت

اور تپاک سے ملے، ہرے پان کھلائے، اور دیر تک دلچسپ باتیں کرتے رہے، مولانا کی شخصیت بڑی پرکشش اور باغ و بہار ہے، ان کے پاس بیٹھ کر اٹھنے کو دل نہیں چاہتا، وہ تنہا ایک انجمن ہیں، علم کے ساتھ مولانا میں اعلیٰ درجہ کی انتظامی صلاحیت بھی ہے ان کے زمانہ میں مدرسہ صولتیہ کو بڑی ترقی ہوئی، مدرسہ صولتیہ ہندوستانی اور پاکستانی حاجیوں کے لیے جائے پناہ ہے، اور ان کی مشکلات میں ہر قسم کی مدد کرتا ہے، مولانا کے صاحبزادے میاں شمیم صاحب بھی اپنے والد بزرگوار کے خلف الرشید ہیں اللہ تعالے مولانا کا سایہ عرصہ دراز تک قائم رکھے، اور میاں شمیم کی عمر و اقبال میں ترقی عطا فرمائے،

طائف کا سفر

طائف قدیم تاریخی شہر اور حجاز کا شملہ اور نینی تال اور حکومت کا گرمائی مستقر ہے، زمانہ قدیم سے امراء و اعیان کا مسکن رہا ہے، عہد رسالت میں بھی یہاں عرب امراء و عمائد کے بہت سے خاندان آباد تھے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان میں تبلیغ اسلام کے لئے طائف تشریف لے گئے تھے مگر وہ لوگ اپنی بڑائی کے گھمنڈ میں آپ کے ساتھ بڑی گستاخی سے پیش آئے، اور طائف کے عوام کو بھڑکا دیا، انھوں نے ذات اقدس پر اتنے پتھر برسائے کہ آپ لہولہان ہوگئے، اس لئے طائف کو دیکھنے کا بڑا اشتیاق تھا، عام حاجی خاص اجازت کے بغیر مکہ مدینہ اور جدہ کے علاوہ کسی دوسرے شہر میں نہیں جاسکتے، لیکن ہم لوگ حکومت کے مہمان تھے، اس لئے شروع ہی میں ہم ایک پروانہ راہداری مل گیا تھا، جس میں ہماری تصویریں تھیں اور متعلقہ عہدہ داروں کے نام ایک تحریر تھی کہ ہم لوگ وزارت اعلام کے مہمان ہیں، ہمارے آنے جانے میں کوئی روک ٹوک نہ کیجائے، اور جہاں جانا چاہیں ہمارے لئے سفر کی سہولت مہیا کیجائے، ایک کار ہمارے لئے مخصوص تھی، اس لئے ایک دن صبح ناشتہ کے بعد رشاد عبد اللہ کی

رفاقت میں طائف گئے، اور چند گھنٹے گھوم پھر کر شام کو واپس آ گئے، طائف کئی ہزار فٹ کی بلندی پر ہے، مگر پیچ دار سڑکیں بڑی اعلیٰ درجہ کی ہیں، شملہ اور نینی تال کی طرح اس کی آبادی تلے اوپر نہیں ہے، بلکہ اوپر جا کر کئی میل کا مسطح میدان ہے، جس پر شہر آباد ہے، طائف کے دو حصے ہیں ایک پرانا جس کا نام یاد نہیں رہ گیا، یہ زیادہ ٹھنڈا ہے، اس کی آبادی کم ہے، اس سے چند میل آگے بڑھکر دوسرا حصہ ہے، جو بہت آباد ہے، اور حجاز کے دوسرے شہروں کی طرح بڑی ترقی کر رہا ہے، بکثرت نئے طرز کی عمارتیں بن گئی ہیں، طائف کے قدیم آثار میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ کا مزار ہے اور آپ سے منسوب ایک مسجد ہے، طائف کے میوے خصوصاً انار مشہور ہے،

شاہی دعوت مکہ معظمہ کے قیام کے زمانہ میں کئی تقریبوں میں شرکت کا موقع ملا، ہر سال کی طرح اس سال بھی ملک فیصل کی جانب سے ممتاز حاجیون اور مشہور شخصیتوں کی دعوت تھی راقم اور مولانا عبدالسلام صاحب بھی مدعو تھے، یہ تقریب ایک وسیع اور خوبصورت ہال میں ہوئی تھی، مہمانون کے آنے کے تھوڑی دیر بعد ملک فیصل مسلح گارڈ کی جلو میں تشریف لائے اور سیدھے اسٹیج پر جا کر بیٹھ گئے، ان کے ساتھ اسلامی ملکوں کے بعض سربراوردہ شخصیتین بھی اسٹیج پر تھیں، شاہ کے آنے کے بعد شعراء نے ان کی شان میں قصیدے پڑھے، پھر جلسہ کا آغاز کلام مجید کی تلاوت سے ہوا، اس کے بعد شاہ نے اسلامی اتحاد کی ضرورت اور اسرائیل کے خلاف بڑی فصیح و بلیغ اور پُرجوش تقریر کی، بعض اور تقریرین بھی ہوئیں، اس کے بعد حاضرین کھانے کے لیے اٹھے، ہال کے باہر ایک وسیع لان پر کھانے کی میزیں آراستہ تھیں، جن میں انواع و اقسام کے عربی اور انگریزی کھانے اور مختلف قسم کے ٹھنڈے مشروبات تھے ہندوستان کی بھی بعض بڑی سرکاری

دعوتون میں شرکت کا اتفاق ہوا ہے مگر ان کو اس شاہی دعوت کے تکلفات سے کوئی نسبت ہی نہیں تھی، اس دعوت میں رابطۂ عالم اسلامی کے پاکستانی رکن ظفر احمد صاحب انصاری اور محمد یوسف صاحب امیر جماعت اسلامی ہند اور بعض دوسرے ہندوستانیوں سے ملاقات ہوئی، دعوت کے بعد ملک فیصل نے مدعوئین کو سلام اور مصافحہ کا موقع دیا، مجمع بہت تھا، رات زیادہ آ چکی تھی، ملاقات کے انتظار میں دیر تک ٹھہرنا پڑتا اسلئے بہت سے لوگ واپس چلے گئے تھے، راقم بھی ان کے ساتھ چلا آیا۔

وفود کا اجتماع، حج کے بعد ایک شب کو منیٰ کی سرکاری عمارت میں، اسلامی ملکوں کے وفود کا جلسہ ہوا، اس میں اسلامی اور عرب ملکوں کے نمایندے شریک تھے، ہم لوگ تو اسی عمارت میں ٹھہرے ہوئے تھے اور اس میں مدعو بھی تھے، پہلے چائے اور قہوے سے حاضرین کی تواضع کی گئی، اس کے بعد کھانا ہوا، یہ کھانا خالص عربی مذاق کا اور دسترخوان پر تھا، کھانے کے بعد تلاوت قران مجید سے جلسہ کا آغاز ہوا مصر کے ایک مشہور قاری نے جو قرأت کے سلسلہ مین ہندوستان بھی آ چکے ہیں، قرأت کی، اس کے بعد تقریرون کا سلسلہ شروع ہوا، یہ تقریرین بہت مختصر اور برائے نام تھیں، جلسہ کے کنڈکٹر بڑے ظریف تھے ان کے لطائف سے حاضرین بہت محظوظ ہوئے، فلسطین کے نمایندے کی تقریر سنجیدہ اور پُرجوش تھی،

ہم لوگوں کو طوافِ زیارت کرنا تھا، اسوقت طواف زیارت کرنے والوں کا ہجوم تھا، اس لئے دن میں طواف کرنے کی ہمت نہیں پڑی رات کو نسبتہً ہجوم کم ہو جاتا ہے اس لئے ابھی تقریروں کا سلسلہ جاری تھا کہ ہم لوگ اٹھ کر چلے آئے اور آدھی رات کو مکہ جا کر طواف زیارت کیا، اس اجتماع میں تمام حاضرین کو جرمنی کے چھپے ہوئے

نہایت خوبصورت کلام مجید کا ایک ایک نسخہ ہدیۃً دیا گیا۔

ندوۃ الشباب کا جلسہ

اسی زمانہ میں ندوۃ الشباب یعنی دنیائے اسلام کے نوجوان مسلمان طلبہ کا جلسہ ریاض میں ہوا تھا، پھر اس کا ایک اجتماع مکہ معظمہ میں ہوا، جہاں تک یاد آتا ہے شاہی دعوت ہی کی تقریب میں ہوا تھا، اس میں مسلم یونیورسٹی، جامعہ ملیہ اور بعض دوسرے مسلم تعلیمی اداروں کے نمائندے بھی شریک تھے، متعدد طلبہ نے تقریریں کیں، غالباً مدراس کے ایک طالب علم نے انگریزی میں تقریر کی تھی، آج کل طلبہ ہر میدان میں پیش پیش رہتے ہیں، اگر ان کے اندر مذہبی احساس پیدا ہو جائے تو ان سے دینی اصلاح کا بڑا کام لیا جا سکتا ہے۔

رابطۂ اسلامی کی ایک نشست میں شرکت

اس زمانہ میں رابطۂ اسلامی کے بھی جلسے ہوئے تھے، ہم لوگوں نے بھی ایک جلسہ میں جس میں مولانا سید ابو الحسن علی کا مقالہ پڑھا گیا تھا، شرکت کی، یہ مقالہ ان کی دوسری تقریروں اور تحریروں کی طرح بڑا فاضلانہ اور دینی روح سے معمور تھا، اور اس کی حیثیت ایک مستقل تصنیف کی ہے، مقالہ ختم ہونے کے بعد دنیائے اسلام کے متعدد فضلاء نے مقالہ کے متعلق اپنے تاثرات بیان کئے، ان میں غالباً عراق کے ایک فاضل کی تقریر بڑی پُرجوش تھی،

ان اجتماعات میں اسلامی ملکوں کے سربرآوردہ لوگوں سے ملاقاتیں اور اور بعض سے تبادلۂ خیالات بھی ہوا، مگر ان کے نام نوٹ نہیں کئے تھے، اس لئے یاد نہیں رہ گئے، ایک دن جامعۂ ازہر مصر کے شیخ سے بھی ملاقات ہوئی تھی۔

مکہ معظمہ میں تین چار دن قیام کے بعد ۱۶ اپریل، ۱۲ ذی الحجہ کو مدینہ طیبہ روانہ ہوئے یہاں مسجد نبویؐ سے متصل، مدینہ ہوٹل میں ٹھہرے، اس وقت مدینہ طیبہ میں زائرین کا اتنا ہجوم تھا کہ

مسجد نبویؐ میں جگہ ملنا مشکل تھی، باہر سڑکوں اور گلیوں تک میں نماز ہوتی تھی، پہلے دن تو کسی نہ کسی طرح اندر نماز پڑھی اور بارگاہ نبویؐ میں صلوٰۃ وسلام پیش کرنے کی سعادت حاصل کی، اس کے بعد بہت کم اندر نماز پڑھنے کا موقع مل سکا، ہزاروں آدمیوں کی طرح ہمارے کندھے پر بھی مصلیٰ رہتا تھا، جہاں جگہ مل جاتی تھی نماز پڑھ لیتے تھے، لیکن آستان نبوی کی حاضری کے لئے دل تڑپتا تھا، اللہ تعالےٰ نے اس کا ایسا انتظام فرما دیا جو کم خوش نصیبوں کے حصہ میں آیا ہوگا، عشاء کی نماز کے تھوڑی دیر بعد مسجد نبویؐ کے دروازے بند ہو جاتے ہیں، رات کو کسی کو اندر رہنے کی اجازت نہیں، پھر تہجد کے وقت کھلتے ہیں، اور اسی وقت سے نمازیوں اور زائرین کا ہجوم شروع ہو جاتا ہے، اس لئے سکون و اطمینان سے مسجد نبویؐ کے مقدس آثار میں نفلیں پڑھنے اور صلوٰۃ وسلام پیش کرنے کا موقع کسی کو بھی نہیں ملتا، حکومت نے یہ انتظام کر دیا تھا کہ خود اور حکومت کے دوسرے معزز مہمانوں کے لئے مسجد کے دروازے بند ہونے کے بعد گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے کے لیے کھول دیے جایا کریں، چنانچہ جب مسجد بالکل خالی ہو جاتی تھی تو ہم لوگوں کے لئے مسجد کا ایک دروازہ کھول دیا جاتا تھا، ہم سب مسجد میں جا کر پورے اطمینان اور یکسوئی کے ساتھ صلوٰۃ وسلام پیش کرتے تھے، اور روضۂ جنت، محراب نبویؐ اور دوسرے مقدس آثار میں نفلیں پڑھتے تھے، اس وقت عجیب کیف و سرور کا عالم ہوتا تھا، مسجد نبویؐ میں یوں ہی بڑی موہنی اور سکینت ہے، رات کے سناٹے میں جو نور اور سکینت برستی ہے اس کا اندازہ اس منظر کو دیکھنے کے بعد ہی ہو سکتا ہے، راقم صلوٰۃ وسلام پیش کرنے اور نفلیں پڑھنے کے بعد مولانا جامی کی نعتیں اور دوسرے نعتیہ اشعار پڑھا کرتا تھا، اس وقت عجیب کیفیت محسوس ہوتی تھی، "سکوتِ شب کا سناٹا ہے اور دل کی کہانی ہے" کا منظر نظر آ جاتا تھا،

اس سلسلہ میں ایک دلچسپ واقعہ قابلِ ذکر ہے، ایک رات کو کسی عرب ریاست کے شیخ آئے تھے، ان کے ساتھ مسلح باڈی گارڈ تھا، شیخ اور ان کے رفقا محرابِ نبویؐ پر دیر تک نفلیں پڑھتے رہے، ایک ہٹتا تو دوسرا اس کی جگہ آجاتا تھا، دوسرے لوگوں کو موقع ہی نہ ملتا تھا، راقم تاک میں لگا رہا، ایک مرتبہ جیسے ہی ایک شخص ہٹا مصلیٰ پر لپک کر پہنچ گیا، اور پورے اطمینان سے نفلین پڑھیں، مولانا عبدالسلام قریب ہی کھڑے تھے، نفلین ختم کرنے کے بعد انھوں نے کہا کہ تم نے بڑا خطرہ مول لے لیا تھا، میں نے پوچھا کیوں؟ انھوں نے کہا شیخ کے ساتھ مسلح باڈی گارڈ تھا، میں نے ان کو اطمینان دلایا کہ وہ رسمی طور پر ساتھ تھا، مسجد نبویؐ میں کوئی شخص کسی کو نہیں ہٹا سکتا،

مدینہ طیبہ میں ایک بڑی دولت حضرت الشیخ مولانا محمد زکریا دامت برکاتہم کی زیارت کی حاصل ہوئی، حضرت کا قیام مسجد نبویؐ سے متصل مدرسہ شرعیہ میں تھا، ان کے حکم سے میں اور مولانا عبدالسلام صاحب رات کا کھانا حضرت ہی کے دسترخوان پر کھاتے تھے، جو سہارنپور کی طرح مدینہ طیبہ میں بھی وسیع تھا، اس حیثیت سے ہمارے لیے یہ کھانا بڑی نعمت تھا کہ ہوٹل کا انگریزی اور عربی مذاق کا کھانا کھاتے کھاتے طبیعت اُب گئی تھی، حضرت کے دسترخوان پر ہندوستانی کھانا ملتا تھا، حضرت غایت شفقت میں کسی کسی دن پان بھی ساتھ کر دیتے تھے، جو مدینہ طیبہ میں بڑی نعمت ہے،

راقم کا ارادہ تھا کہ مدینہ طیبہ میں جتنے دن بھی قیام کا موقع مل سکے گا اور جدہ میں مقیم اعزہ و احباب سے ملاقات کے لیے دو تین دن قیام رہے گا، اور اپنے مرافق رشاد عبداللہ سے کہہ بھی دیا تھا کہ وہ واپسی کے پروگرام میں اس کا لحاظ رکھیں گے، انھوں نے وعدہ بھی کیا تھا، مگر پروگرام بنانا ان کے اختیار میں نہ تھا، ابھی مدینہ طیبہ میں ایک ہفتہ

بھی پورا نہیں ہوا تھا کہ ایک دن دوپہر کو رشاد عبداللہ نے اطلاع دی کہ جدہ سے فون آیا ہے کہ کل صبح سعودی ایر لائن کے جہاز سے ہم لوگوں کو جانا ہے، اور رات تک ہم کو جدہ پہنچ جانا چاہیے، اگرچہ ابھی دل واپسی کے لیے تیار نہ تھا، مگر حج ختم ہو چکا تھا، مدینہ طیبہ میں بھی حاضری ہو چکی تھی، کوئی ضروری کام باقی بھی نہ رہ گیا تھا، اگر اس وقت واپسی کے لیے آمادہ نہ ہوتا تو پھر معلوم نہیں کب تک اس کا انتظام ہو سکتا، ہماری طرح دوسرے جو وفود آئے تھے، وہ بھی واپس ہو رہے تھے، اس لئے واپسی ہی مناسب معلوم ہوئی، اتفاق سے اُس دن مدینہ طیبہ بلکہ پورے حجاز میں ہندوستان جیسی تیز بارش ہو رہی تھی، اسی میں سہ پہر کے قریب با حسرت و یاس مدینہ سے روانہ ہوئے،

حیف در چشم زدن صحبتِ یار آخر شد روئے گل سیر ندیدیم و بہار آخر شد

اور رات کو جدہ پہنچے، رات بھر فندق ریاض میں قیام رہا، فجر کے بعد ہی ہوائی اڈہ کی راہ لی، اس لیے جدہ میں بھی کسی سے ملاقات نہ ہو سکی البتہ مکہ میں جمال میاں فرنگی محلی سے جو پاکستان کی جانب سے رابطہ کے جلسہ میں شرکت کیلئے آئے تھے، کئی سال کے بعد ملاقات ہوئی تھی، جس سے بڑی مسرت ہوئی،

ان سارے مراحل میں ہمارے شفیق مرافق رشاد عبداللہ ساتھ ساتھ تھے، اور ہم کو رخصت کر کے واپس ہوئے، ۹ بجے دن کو ہمارا ہوائی جہاز جدہ سے روانہ ہوا، اور ریاض، ظہران، اور کراچی ہوتا ہوا مغرب کے بعد بمبئی پہنچا، واپسی میں بھی منشی عبدالعزیز صاحب انصاری کے یہاں قیام رہا، اتفاق سے اس وقت منشی جی شادی کی تقریب میں شرکت کیلئے وطن گئے ہوئے تھے، مگر انکے صاحبزادے ابو صالح سلمہٗ موجود تھے، وہ میزبانی میں اپنے والد کے صحیح جانشین ہیں، انھوں نے اسطرح میزبانی کے فرائض انجام دے کہ منشی عبدالعزیز صاحب کی کمی محسوس نہ ہونے دی، انہی کی کوشش سے تین چار دن میں واپسی کا ٹکٹ مل گیا، اور ہم لوگ وسط جنوری میں وطن واپس ہو گئے، مولانا عبدالسلام صاحب نے بمبئی سے ندوہ تار دے دیا تھا اسلئے لکھنؤ اسٹیشن پر عزیزانِ ندوہ آ گئے تھے، مگر راقم نے وطن کسی کو اطلاع نہیں دی تھی اور دفعۃً گھر پہنچا،

(باقی)

صاحب الاغانی ابو الفرج الاصبہانی

(حیات اور ادبی خدمات)

از جناب مولوی شفیق احمد خانصاحب ندوی، ایم۔ اے شعبہ عربی مسلم یونیورسٹی علی گڈھ،

مشہور حکایت نگار ادیب ابو الفرج الاصبہانی کا نام دنیاے ادب میں زندۂ جاوید ہے۔ وہ ایک مایۂ ناز انشا پرداز روایت نگار، ماہر لسان ولغت ادیب ہی نہیں شاعر، نقاد، مؤرخ، مرقع نگار اور مصور عصر بھی تھا، علم انساب اور دوسرے علوم متداولہ کے ساتھ ساتھ موسیقی، اور ساز وسرود کا ماہر بھی تھا۔

اجمالی تعارف اور تاریخی پس منظر

ابو الفرج الاصبہانی تیسری اور چوتھی صدی ہجری کا ایک نامور صاحبِ قلم ہے، کتاب الاغانی اس کی سب سے مشہور تصنیف ہے جو اکیس[۲۱] جلدوں میں ہے اور پچاس[۵۰] برس کی محنت شاقہ کے بعد مکمل ہوئی تھی، یہ ایک طرح کی ادبی انسائکلو پیڈیا ہے جس کی مقبولیت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ دنیا کی تمام بڑی زبانوں میں اس کے ترجمے ہو کر ادبیات عالم میں جگہ پا چکے ہیں۔ اہل مغرب خصوصیت سے اس کتاب کے شیدائی رہے ہیں۔

ابو الفرج نے بچپن کے سولہ[۱۶] سال تیسری صدی ہجری میں گزارے، اس کے بعد کی زندگی چوتھی صدی ہجری میں گذری بغداد اس کا مولد ومسکن تھا۔ جو اپنی اہمیت کے لحاظ سے اس زمانہ میں اُم البلاد کی حیثیت رکھتا تھا۔ اصبہانی کا زمانہ عیش وعشرت طوائف الملوکی، اور علوم وفنون کی ترقی کے لیے مشہور ہے۔ یہ علم وادب کا عہد زریں تھا۔

عباسی عہد کا یہ تیسرا دور علوم وفنون کی ترقی کے ساتھ چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں تقسیم ہو کر رنگ رلیوں، فضول خرچیوں اور عیش پرستیوں کے لیے مشہور رہے، ابو الفرج اصبہانی اسی دور کا نمایندہ ہے۔

جاحظ کی وفات جس سال ہوئی اسی سال ابو الفرج کی ولادت ہوئی، ابو الفرج نے جاحظ کے علمی وادبی ترکہ سے پورا فائدہ اٹھایا، ابو تمام بحتری اور ابن الرومی کا دور عروج ابو الفرج کے عنفوان شباب کا زمانہ تھا، اس نے ان تینوں شعرا کی نازک خیالی، پُرگوئی اور حُسن ادا سے استفادہ کیا، باقی زندگی ابو الفرج نے متنبی جیسے بلند پایہ شاعر کے عہد میں بسر کی جس کی شاعری کی پوری دنیائے عرب میں دھوم تھی، اور اس کا یہ دعویٰ تھا

إذا قلت شعراً أصبح الدهر منشداً وما الدهر إلا من رواة قصائدي

غرض ابو الفرج کا زمانہ مادّی اور فکری دونوں حیثیتوں سے ترقی کا دور تھا، عربی زبان پختہ ہو کر زندگی کے نازک تر مسائل کی ترجمان بن چکی تھی، اور اس کی شاعری سماج میں اس حد تک رچ بس گئی تھی کہ کوئی طبقہ بھی اس کے ذوق سے خالی نہ تھا، اور اس کے نئے نئے اسلوب پیدا ہو گئے تھے، اور تنقید ادب کے نئے پہلو فکر وفن کو جلا بخش رہے تھے، ابو الفرج نے اس سے پورا اثر قبول کیا، دنیاوی حیثیت سے بھی اس کو وجاہت حاصل تھی، عرصہ تک وہ مشہور بویہی حکمراں ابو محمد الوزیر المہلبی کا ہم نشین اور رکن الدولہ کا سکریٹری رہا۔ سیف الدولہ کے دربار سے بھی منسلک رہا۔ بنو امیۂ اندلس سے بھی اس کے تعلقات استوار وخوشگوار تھے۔

اس طرح اس کو بغداد، حلب اور اندلس وغیرہ کے مختلف ومتضاد علمی وتمدنی

سرچشموں سے استفادہ کا پورا موقع میسر ہوا، بغداد میں فارسی الاصل شیعی اور شعوبی اثرات، حلب میں عربی حمدانی قوم پرستی کے رجحانات اور مغرب کے اموی تاثرات اور ان سب کی باہمی کشمکش نے ابوالفرج کے مزاج میں وسعت اور آزاد مشربی پیدا کر دی تھی، اور وہ اپنی فطری صلاحیتوں کی بنا پر موقع شناس اور عیش پسند فنکار شاعر اور آزاد مشرب ادیب کی حیثیت سے ابھرا اور دیکھتے دیکھتے دنیائے عرب میں مشہور ہو گیا[1]۔

حالات زندگی۔ ابوالفرج اصبہانی نسلاً اموی اور آخری اموی خلیفہ مروان بن محمد کے اجداد میں تھا، اس کی ولادت ۲۸۴ھ میں معتضد باللہ کے عہد میں اصبہان میں ہوئی، بچپن بغداد میں گزارا، اور اس کی یہیں نشو و نما ہوئی، یہاں چوٹی کے ادبار میں شمار کیا جاتا تھا۔ بڑے بڑے اہل کمال سے استفادہ کیا۔ افراد و قبائل کے حسب و نسب پر اس کو بڑا عبور حاصل تھا۔ اموی ہونے کے باوجود شیعی تھا جس پر ابن الاثیر نے تعجب کا اظہار کیا ہے۔ تنوخی کا قول ہے کہ جن شیعہ ارباب فضل و کمال سے میں ملا، اُن میں ابوالفرج اصبہانی بے شمار اشعار کا حافظ اور راگ راگنیوں کا بہت بڑا واقف کار تھا۔ حدیث اور تاریخ پر بھی اچھی نظر رکھتا تھا۔ آثار صحابہ و تابعین کا بھی عالم تھا، خصوصاً احادیث مسندہ اور انساب پر غیر معمولی نظر تھی، اس کی جیسی قوت حافظہ میں نے کسی میں نہیں دیکھی۔ مذکورہ بالا علوم و فنون کے علاوہ لغت، نحو، داستان گوئی، سوانح و سیر اور مغازی وغیرہ میں آپ اپنی نظیر تھا۔ علم مجلسی کا بھی بڑا واقف کار تھا، بیطاری، شکاری پرندوں کے علم طب اور نجوم میں بھی اسکو دسترس

---

[1] صاحب الأغانی: للدکتور محمد احمد خلف اللہ سے ملخصاً

حاصل تھی۔ اس کے اشعار میں علماء کے کلام جیسی پختگی اور ظریف الطبع شعراء جیسی روانیاں تھیں، کتابیں اچھوتی اور بے مثل لکھیں، جن میں آغانی شہرۂ آفاق ہے[1]۔

ماحول۔ ابوالفرج نے تیسری اور چوتھی صدی کے جن باکمال اہل علم سے استفادہ کیا، ان میں ابن درید، ابن الانباری، الجحی، اخفش، نفطویہ، طبری، ابن المرزبان، ابن قدامہ اور یزیدی جیسے لغت، نحو، ادب، شعر، انساب، حدیث، تفسیر اور تاریخ کے فضلاء و ائمہ ہیں، ابوالفرج کی شخصیت کی تعمیر میں ان کا بڑا حصہ ہے۔ اغانی کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے فکر و فن کی تعمیر میں اس کے خاندان کے شعری و ادبی ماحول کا اہم حصہ ہے۔ اس کا پورا گھرانہ شعر و سخن کے رنگ میں رنگا ہوا تھا، اس کی چچی ساز و غنا کی دلدادہ تھیں، اس کے والد کو موسیقی سے بڑی دلچسپی تھی[2]، آل مرزبان اس زمانہ میں گانوں اور موسیقی کے راگوں میں باکمال سمجھے جاتے تھے، ذوق کے اس اشتراک کی بنا پر آل مرزبان اور ابوالفرج کے خاندان میں گہری دوستی تھی، علم و ادب بھی اس کو وراثۃً ملا تھا۔ تعلیم و تعلم اور ادبی افادہ و استفادہ کے اس ماحول نے ابوالفرج کی سیرت و شخصیت کی تعمیر میں اہم رول ادا کیا۔

اخلاق و کردار۔ ابوالفرج بڑا ملنسار، شیریں گفتار، آداب مجلس کا ماہر اور عیش و طرب کی مجلسوں کا دلدادہ تھا، مغنیوں اور طوائفوں کے یہاں رہتا اور شراب پیتا تھا، بطرس البستانی لکھتا ہے۔

---

[1] مقدمۃ الأغانی الأب الطون صالحانی الیسوعی، ص ۱۰ [2] الاغانی ج ۱، ص ۱۳۳

"کان ابو الفرج الاصبهانی لطیف المنادمة حسن المعاشرة
حلو الحدیث، یحب اللذة و مجالس اللهو ویشرب
الخمر ویصحب القیان والمغنیین"[1]

یاقوت حموی (صاحب معجم الادباء) کا بیان ہے کہ ابو الفرج بڑا لاابالی
تھا، صفائی ستھرائی اور لباس کی طرف اس کی کوئی توجہ نہ تھی، جب تک
کپڑے پھٹ نہ جاتے نہ بدلتا تھا۔ وزیر مہلبی کو اس کی یہ عادت بڑی ناگوار تھی مگر
اس کے علم و فضل اور شعر و ادب کی بنا پر گوارا کرتا تھا، اس کو جانوروں سے بڑی
دلچسپی تھی، اس کے یہاں بہت سے جانور پلے تھے، ان میں ایک بلی بھی تھی جس کا نام
یقق رکھا تھا، اس کا تذکرہ اس کے کلام میں بھی ہے، اس کے مرنے پر اس نے
اس کا مرثیہ بھی لکھا تھا، مرغوں کے پالنے کا بھی شائق تھا "رثاء دیک" اسکا
مشہور مرثیہ ہے، جس میں اس نے اپنے مرغ کا سراپا نہایت دلکش انداز میں
لکھا ہے، لوگ اس کی ہجو سے ڈرتے تھے، مگر منہ پھٹ ہونے کے باوجود نہایت
خوش مزاج، دلچسپ اور بذلہ سنج تھا، اپنی خوش گفتاری، لطیفہ گوئی اور ظرافت
سے مہلبی جیسے وزیر کا نہایت مقرب مصاحب اور ندیم رہا۔

تشیع

پطرس بستانی کی تحقیق ہے کہ ابو الفرج شیعہ تھا، چونکہ شیعوں کے درمیان
اس کی تعلیم و تربیت ہوئی، انھیں سے میل جول رہا، اس پر شیعوں کے احسانات
بھی رہے تھے، اس لئے اموی الاصل ہونے کے باوجود شیعیت پر قائم رہا۔ وکان
علی اُمویتہ یتشیع للعلویین لتربیتہ بینهم ومخالطته لهم

۱؎ ادباء العرب فی الأعصر العباسیة (بطرس البستانی) ص ۱۳۳

واشتماله بأغانيهم"[1]

پوری اغانی ایک طرح سے بالواسطہ یا بلاواسطہ اکثر و بیشتر دور بنی امیہ کے
برے پہلوؤں کی تصویر ہے، اس کے باوجود کسی صحابی کی توہین یا براہ راست کسی
شخص کی تحقیر کبھی نہیں کی، وہ زندگی بھر مختلف و متضاد مذاق کے امراء و ملوک کی درباروں
میں رہا، اس وجہ سے مال و زر اور عیش و عشرت کا شیدائی تھا، یہ عجیب بات ہے کہ ایک
طرف اس نے مقاتل الطالبیین میں اپنے کو شیعان علیؓ میں شمار کیا ہے۔ دوسری طرف
اپنی امویت پر بھی فخر کرتا ہے، اصل میں وہ اپنے دور کے سیاسی، سماجی اور فکری رجحانات
کی ترجمانی اور ہم رنگی کے ساتھ بڑی ہوشیاری سے ارباب اقتدار کے عظمت و جلال کو
ختم کرنا چاہتا تھا، چنانچہ اس نے ان کے کمزور پہلوؤں کو نمایاں کیا۔ ارباب حکومت کی
سرمستیوں کے ذکر سے اس کا مقصد آزادی اور آزاد خیالی کے رجحانات کی ہمت افزائی
بھی تھی، اور خوبصورت انداز میں ارباب حکومت پر بالواسطہ تنقید بھی![2]

ابو الفرج اصبہانی کے ادبی کارنامے

یوں تو ابو الفرج کے علمی ادبی کارنامے بے شمار ہیں لیکن
اس کا ادبی پایہ تنہا "اغانی" کی بنا پر مانا جاتا ہے، کتاب الاغانی اس کی شاہکار تصنیف ہے،
مقاتل الطالبیین بھی اس کی تاریخی کتاب ہے، جس میں بنو طالب کے مقتولین کے سوانح
اور ان کے قتل کے اسباب بیان کئے گئے ہیں،

انطون صالحانی الیسوعی نے اغانی کے مقدمہ میں ایک اور کتاب نزهة الملوك
والاعیان فی اخبار القیان والمغنیات، "الاوائل الحسان" کا تذکرہ کیا ہے، اس کے

۱؎ الاستاذ بطرس البستانی: ادباء العرب فی الاعصر العباسیة ص ۱۳۲
۲؎ شفیق جبری: ابو الفرج الاصبهانی، ص ۱۸

بیان کے مطابق اس کتاب میں ابو الفرج نے مشہور گانے والیوں کے حالات زندگی اور ان کے گانے کے طرز پر روشنی ڈالی ہے، اس کے ساتھ بڑے دلچسپ لطائف وظرائف اور پُرلطف حالات قلمبند کئے ہیں۔

یاقوت حموی کے بیان کے مطابق اس کی جملہ تصانیف کی فہرست حسب ذیل ہے[1]

(۱) کتاب الأغانی الکبیر (۲) کتاب الأغانی (مجرّد و ملخص)، (۳) کتاب مقاتل الطالبین۔ (۴) أدب الغرباء (۵) التعدیل والإنصاف فی اخبار القبائل وانسابها۔ (۶) اخبار القیان۔ (۷) الاماء والشواعر (۸) کتاب الممالیك الشعراء (۹) کتاب الدیارات۔ (۱۰) کتاب تفضیل ذی الحجة۔ (۱۱) کتاب الاخبار والنوادر، (۱۲) کتاب أدب السماع۔ (۱۳) کتاب اخبار الطفیلیین۔ (۱۴) کتاب مجموع الاخبار والآثار۔ (۱۵) کتاب الخمارین والخمارات۔ (۱۶) کتاب الفرق والمعیار فی الأوغاد والأحرار۔ (۱۷) کتاب دعوة النجار (۱۸) کتاب اخبار جحظة البرمکی۔ (۱۹) کتاب جمهرة النسب۔ (۲۰) کتاب نسب بنی عبد شمس۔ (۲۱) کتاب نسب بنی شیبان۔ (۲۲) کتاب نسب المهالبة۔ (۲۳) کتاب نسب بنی تغلب۔ (۲۴) کتاب الغلمان المغنین۔ (۲۵) کتاب الخصیان[1]

مگر اب صرف شروع کی چار کتابیں ہی ملتی ہیں، باقی ناپید ہو چکی ہیں۔

وفات۔ ۱۴ ذی الحجہ ۳۵۶ھ میں مدینۃ السلام بغداد میں ابو الفرج اصبہانی

[1] معجم الادباء، ج ۱۳

کی وفات ہوئی، اسی سال ابو علی قالی جیسے عالم اور سیف الدولہ، معز الدولہ بن بویہ اور کافور اخشیدی جیسے ادب نواز بادشاہوں کا بھی انتقال ہوا، اس پر اغانی کے مقدمہ میں الطون صالحانی نے بڑے موثر انداز میں اظہار تاسف کیا ہے

"...... هذا ولما قبض ابو الفرج جفت حدائق الأدب

وذوات اشجار النسب، واصبح الادباء آيتاما، وهانوا بعد

أن كانوا كراما على أن من ترك مؤلفا مثل هذا،

لايموت له ذكر، ولا ينقطع له نشر"

یعنی ابو الفرج کے انتقال سے ادب کے بستان وچمن ویران ہو گئے، انساب کے شگوفے مرجھا گئے، ادبائے دہر بے سہارا ہو گئے۔ لیکن ــــ جس شخص نے ایسی زندۂ جاوید کتاب (کتاب الاغانی) یادگار چھوڑی ہو، اسکا ذکر نہیں مٹ سکتا وہ ہمیشہ ہوتا رہے گا۔

وما مات من أبقى لنا ذخر علمه

وأحيا له ذكرا على غابر الدهر،

جب تک کسی کے علمی ذخائر باقی ہیں وہ نہیں مر سکتا اور ذکر ہمیشہ زندہ رہے گا۔

ابو الفرج: بحیثیت شاعر | نثر نگاری نے ابو الفرج کو باقاعدہ طور پر شاعری اور قصد نگاری کا موقع تو نہیں دیا، پھر بھی اس کا پورا ماحول شاعرانہ تھا،... خود ابو الطیب متنبی اس کا ہمعصر تھا، جس کی شاعری کی دھوم تھی، اس لئے ابو الفرج نے بھی کبھی تفریحاً اور کبھی ضرورۃً شعر وسخن کی طرف بھی توجہ کی، اور اس کا ادب..

[1] مقدمۃ الاغانی (ترجمہ اردو)

اپنے دور کا آئینہ ہوتا ہے، ابوالفرج نے بھی اپنے ادبی دور اور موقع و محل کی مناسبت سے ہجو گوئی، مدح سرائی، توصیفی شاعری اور کبھی کبھی وجدانی اور داخلی شاعری کے پھول کھلائے۔

وصفیہ شاعری وصفیہ شاعری میں ابوالفرج کو کمال حاصل تھا، رثاء دیک، اسکا مشہور مرثیہ ہے جو تاریخ و سیر کی کتابوں میں موجود ہے، یہ مرثیہ اس نے اپنے پالتو مرغ کی موت پر لکھا تھا، اس کا ایک ایک شعر اس کی دقیقہ رسی، تخیل کی بلندی اور جدتِ ادا کا پتہ دیتا ہے، اس نے ایسے انداز میں مرغ کی مرقع نگاری کی ہے جس سے اس کی تصویر نگاہوں کے سامنے پھر جاتی ہے، اس کے کچھ نمونے ملاحظہ ہوں

لهفی علیک ابا النذیر لو أنه دفع المنایا عنک لهف شفیق

اے وہ کہ جو ہمیں ہوشیار رکھنے والا تھا، تیری موت پر ایک مہربان و شفیق کیجانب سے حسرت و افسوس ہو کاش تجھ سے موت ٹالی جاسکتی۔"

اس کے سفید، چمکدار اور رنگ برنگے طاؤسی پروں کی مصوری ان الفاظ میں کرتا ہے،

وکسیت کالطاؤس ریشاً لامعاً متلألأ لها ذار ونق وبریق

من حمرة فی صفرة فی خضرة تخییلها یغنی عن التحقیق

اس کی گردن کے اوپری حصہ کو موج زرین سے تشبیہ دیتا ہے، اور اس کے کیس کو لعل عقیق کے تاج سے تعبیر کرتا ہے، ؎

وکان سالفتیک تبر سائل وعلی المفارق منک تاج عقیق

پھر اس کی سریلی آواز کو یاد کرتا ہے جس میں اسکو موسیقی کے نغمے محسوس ہوتے ہیں؎

نائی دقیق ناعم قرنت به نغم مؤلفة من الموسیق

تاریخ و سیر کی کتابوں میں اس مرثیہ کے ۱۳۰ اشعار منقول ہیں، جو سب بلند پایہ ہیں، بلی کی توصیف پر بھی ابوالفرج کی وصفیہ شاعری کا وصف الھر والفار یعنی چوہے، شاہکار ہے۔

یہ ابوالفرج کی جدتِ طبع تھی کہ اس نے روایتی درباری شاعری سے ہٹ کر ترقی پسندانہ روش اختیار کی اور معمولی چیزوں پر طبع آزمائی کرکے ان کو بڑے دلکش انداز میں پیش کیا۔

مدح سرائی مدحیہ شاعری میں بھی ابوالفرج نے تشبیہات و استعارات سے بڑی ندرت پیدا کی، سیف الدولہ اور وزیر مہلبی کی شان میں اس نے کئی قصائد لکھے جو تاریخ ادب کی زینت ہیں اگرچہ قصیدہ نگاری میں متنبی کے سامنے اس کا چراغ نہ جل سکا، مگر اس میں بھی اس کی شاعرانہ صلاحیتوں کا اعتراف ادیبوں کو کرنا پڑا، وزیر مہلبی کے یہاں بچہ پیدا ہوا تو ابوالفرج نے اس کی تہنیت میں ایک طویل قصیدہ لکھا، اس قصیدہ کا عنوان، میلاد المشتری، ہے، مہلبی کو مبارکباد دیتے ہوئے کہتا ہے؎

اسعد بمولود اتاک مبارکا کالبدر اشرق جنح لیل مقمر

شمس الضحی قرنت الی بدر الدجی حتی اذا اجتمعا انت بالمشتری

آپ کو نوزائیدہ بچہ کی آمد مبارک و مسعود ہو! گویا کہ چودھویں کے چاند نے رات کے گوشے گوشے کو اپنی چاندنی سے روشن کردیا، اور دن چڑھے کے سورج اور اندھیری رات کے روشن چاند کے میل سے مشتری ستارہ نمودار ہوگیا۔

ایک دوسرا قصیدہ تہنیت عید الفطر، کا ہے جس کا مطلع ہے؎

اذا ما علا فی الصدر والنہی الامر   وبسہما فی النفع منہ وفی الضر

یہ سب قصائد شعر و ادب کی جان ہیں،

ہجوگوئی۔ بہت سے اہل ادب نے ابوالفرج کی ہجویہ شاعری کی بڑی تعریف کی ہے جیسا کہ انطون صالحانی نے اغانی کے مقدمہ میں ذکر کیا ہے، لیکن مجھے تو اس کی ہجویات گنوار کی لٹھ سے زیادہ معلوم نہیں ہوتیں، اس کی ہجوگوئی طنز و تمسخر کی روح جو ہجو کی جان ہے بالکل خالی ہے، راضی باللہ کے عہد میں جب ابوعبداللہ بریدی منصب وزارت سرفراز ہوا تو ابوالفرج نے ایک طویل ہجویہ قصیدہ لکھا جس کے دو اشعار یہ ہیں؎

یا سماء اسقطی ویا ارض میدی   قد تولی وزارۃ ابن البریدی

ھدم رکن الاسلام وانھتک الملک   ومحیت آثارہ فھو مودی

ابن البریدی وزارت پر آگیا ہے، اے زمیں تو دھنس کیوں نہیں جاتی، اے آسمان تو ٹوٹ کر گر کیوں نہیں پڑتا۔ اسلام کا ستون گرا دیا گیا، اقتدار رسوا ہو گیا، اس کے آثار مٹا دیئے گئے کیونکہ وہ شخص بربادی کرنے والا ہے،

ایک بار وہ کسی وجہ سے اپنے سرپرست ابومحمد وزیر مہلّبی سے شکوہ سنج ہوا، کہنے لگا، کیا آپ نے کسی گداگر کی طرح مجھکو سمجھا ہے اگر ایسا ہے تو آپ نے گویا غنی بنانے کے بعد مجھکو بلندیوں سے نیچے ڈھکیل دیا ہے۔؎

ابعین مفتقر الیک رأیتنی   بعد الغنی فرمیت بی من حالق

آخر میں کہتا ہے کہ آپ مورد ملامت نہیں ہیں، قصوروار تو میں ہی ہوں، کہ میں نے خالق کائنات کو چھوڑ کر اس کے غیر سے حسن سلوک کا آسرا لگایا۔؎

لست الملوم، انا الملوم لاننی   املت للاحسان غیر الخالق

داخلی اور وجدانی شاعری ایک مرتبہ ابوالفرج بصرہ گیا، وہاں وہ بالکل اجنبی تھا کسی سے بھی واقف نہ تھا، صرف بعض لوگوں کے نام جانتا تھا، اس کس مپرسی کے عالم میں ایک سرائے کی طرف چل پڑا۔ اور ایک کمرہ اسے کرایہ پر ملا۔ اسی کمرہ میں حکایت حال کے طور پر ایک قصیدہ لکھا، یہ قصیدہ داخلی شاعری اور وجدانی کیفیات کی تصویر ہے۔ بطور نمونہ چند اشعار درج کئے جاتے ہیں، ان میں شاعر خدا کا شکر ادا کرتے ہوئے کہتا ہے کہ یہ آخر میں کیا دیکھ رہا ہوں؟ کیا اب دنیا سے میزبانی و مہمانی کی رسم اٹھ چکی ہے؟ بازار کا کھانا اور کرایہ کا گھر تو مجھے اپنا اچھا گھر یاد دلاتا ہے، ایسی حالت میں میں کیونکر خوش و خرم رہ کر چین کی نیند سو سکتا ہوں، وہی پاک ذات غیب کی بات جانے! اس مفہوم کو شاعر نے اس طرح ادا کیا ہے۔

الحمد للہ علی ما اری   من صنعتی من بین ھذا الوری

اصار فی الدھر الی حالۃ   یعدم فیہ الضیف عند القری

صبح اذا السوق لی مأکلا   وصار خیر البیت خبز الشری

وبعد ملکی منزلا مبہجا   سکنت ماما من بیوت الکری

فکیف الغنی لاھیا ضاحکا   وکیف اخطی بلذیذ الکری

سبحان من یعلم خلفنا   وبین ایدینا وتحت الثری

ان نمونوں سے ابوالفرج کی شاعری کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے، گو متنبی کی موجودگی میں اس کی شہرت کا چراغ روشن نہ ہو سکا، اگرچہ نثر و انشاء کی مشغولیت نے اسکو شاعری کی طرف توجہ کرنے کا موقع نہیں دیا، پھر بھی اس حقیقت سے انکار نہیں ہو سکتا کہ وہ نثر و انشاء کا امام ہونے کے ساتھ ساتھ خوش گو شاعر بھی تھا، اسکی شاعرانہ حیثیت نظر انداز نہیں کی جا سکتی۔

لہ شفیق جبری: ابوالفرج الاصبہانی ص ۳۰،

ابوالفرج اصبہانی بحیثیت نثار | بنیادی طور پر ابوالفرج اصبہانی ایک نثار، انشاء پرداز اور صاحبِ طرز ادیب تھا۔ اس کا جوہر نثر و انشاء ہی کے میدان میں نمایاں ہوا نثری ادب میں اس کا حصہ نہایت اہتم بالشان ہے۔ اور اس کی بیشتر ادبی خدمات کا تعلق چار دائروں سے ہے۔

(۱) حکایت نگاری، (۲) تاریخ نویسی، (۳) تنقید نگاری، (۴) مرقع نگاری اور تصویر کشی،

حکایت نگاری، | حکایت نگاری ابوالفرج کا خاص موضوع ہے۔ اغانی کی حکایات میں اس نے ادبی رنگ و آہنگ میں عرب اور ایام عرب (بشمولیت خلفاء اسلام و مسلمان امراء) کے واقعات، ادباء و شعراء کے قصوں، سازندوں اور موسیقی کاروں کے لطیفوں کو اس دلچسپ اسلوب نگارش میں پیش کیا ہے، جس کی دوسری مثال مشکل سے مل سکتی ہے۔ اغانی کے مقدمہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس نے اس کتاب میں اغانی (راگ راگنی) اور مغنیوں کے حالات بیان کرنے کا ارادہ کیا تھا، لیکن پھر حکایت سے حکایت نکلتی چلی گئی، اور ضمناً اخبار و آثار، سیر، اشعار، ادبی قصص اور لطائف و ظرائف بھی شامل ہوتے گئے، اور فن کاروں کے ذکر میں ان کے اخلاق و عاداتؔ اور فکر و فن پر تبصرہ بھی شامل ہوگیا، اس طرح حکایت نگاری کے پردہ میں ایک عہد کی پوری زندگی اس کتاب میں جلوہ آرا ہوگئی، ابوالفرج خلفاء و امراء کے درباروں اور خلوت خانوں میں گھس گھس کر حالات و واقعات معلوم کرتا، پھر عوام کے سامنے ان کی پردہ دری کرتا تھا، اگرچہ ان واقعات کی تاریخی حیثیت پر بحث و نظر کی گنجائش ہے، لیکن اس دور کی عام اجتماعی حالت کی تصویر کشی کی صداقت میں کسی کو کلام نہیں جس طرح فسانۂ آزاد کی

کوئی تاریخی حیثیت نہیں، لیکن اس میں اس دور کے تمدن کی جو تصویر پیش کی گئی ہے، وہ بڑی حد تک صحیح ہے،

تاریخ نویسی | خالص تاریخ میں ابوالفرج کی کوئی کتاب موجود نہیں، کتاب الاغانی کی حکایات و مرویات کی حیثیت نیم تاریخی، قصوں سے زیادہ نہیں، جو بعد میں رومانس (Romance) میں تبدیل ہوتے گئے۔[1]

اغانی کی اہمیت و شہرت کی وجہ اس کی تاریخی حیثیت نہیں بلکہ ادبی ہے، اس سے ایک ادیب اور انشاء پرداز کے ذوق کی آسودگی ہوتی ہے، اور متفرق واقعات کی روشنی میں چند ادوار کی عمومی جھلک بھی دیکھی جا سکتی ہے، لیکن ایک مورخ و محقق کی تسکین کا سامان اس میں نہیں ہے،

البتہ ابوالفرج کی ایک دوسری تصنیف، مقاتل الطالبیین ہے جو تاریخی سیر و سوانح کی کتاب ہے اس میں اسکا تاریخی ذوق نمایاں ہے، یہ کتاب ۲۹ سال کی عمر میں اس نے مکمل کرلی تھی، اس میں عہد رسالت سے لیکر ۳۱۳ھ تک بنی طالب کے جتنے لوگ قتل کئے گئے اُن سب کی سیر و سوانح اور اسبابِ قتل روایت حدیث کے طرز پر رواۃ کے سلسلہ کے ساتھ لکھے گئے ہیں۔

ثعلبی کی قادر الکلامی کی تعریف میں کہتا ہے،

ویقتضب المعنی الکثیر بلفظہ	وہ برجستہ و بے ساختہ بہت سا مفہوم
ویاتی بما تحوی الطوامیر فی	اپنے لفظ میں ادا کر دیتا ہے اور ایک
فی سطر	سطر میں ذخیرے بھر دیتا ہے،

[1] ابوالفضل، تاریخ ادبیات عربی ص ۱۵۴،

ٹھیک یہی بات اس پر بھی صادق آتی ہے۔ مقاتل الطالبین میں تاریخ نویسی کا پورا انداز ہے، سلسلۂ رواۃ مکمل موجود ہے، خواہ رواۃ کسی پایہ کے ہوں اس میں ابو الفرج نے دروغ برگردن راوی کے اصول پر عمل کیا ہے،

تاریخ نویسی کا لفظ یہاں پر عام معنوں میں استعمال کیا گیا ہے، ورنہ تاریخ نویس اور سوانح نگار کا فرق اس میں بھی قائم ہے، مورخ کا مطالعہ معروضی (Objective) ہوتا ہے، اور اس کی حیثیت پوسٹ مارٹم کرنے والے ڈاکٹر کی سی ہے، اس کے مقابلہ میں سوانح نگار کا مطالعہ تمام تر موضوعی (subjective) ہوتا ہے۔ اور اسکی حیثیت ایک دردمند عزیز کی ہوتی ہے،

اس کتاب میں اغانی سے زیادہ تاریخ نویسی کے آداب ملحوظ رکھے گئے ہیں اس لئے اس کو مصنف کی تاریخی خدمات میں شمار کیا جاتا ہے۔ مثلاً آل جفنہ کے مشہور حکمراں جبلہ بن ایہم کا اسلام لانا، اور پھر حضرت عمرؓ کے عادلانہ و مساویانہ فیصلہ پر اس کا ارتداد ایک تاریخی واقعہ ہے۔ یہ واقعہ بہت سی تاریخوں میں ہے اس کے آخری چند الفاظ نقل کئے جاتے ہیں۔ جس سے فکر و نظر کے دو بنیادی اختلافات پر روشنی پڑتی ہے، اس زمانہ میں بادشاہ عام لوگوں سے بالاتر سمجھا جاتا تھا، اور حضرت عمر فاروقؓ تمام انسانوں کے ۔۔۔۔۔۔ درمیان عدل و مساوات کے قائل تھے۔

قال عمرؓ: أمر بهشم انفك	حضرت عمرؓ نے فرمایا جبلہ جیسا تم نے
يا جبلة كما فعلت، قال	کیا ہے میں بھی مضروب کو تمھاری
جبلة وكيف ذالك يا	ناک توڑنے کا حکم دوں گا جبلہ نے کہا
امير المومنين وهو سوقة،	امیر المومنین یہ کیوں وہ ادنیٰ درجہ کا
وانا ملك قال ان الاسلامؓ	آدمی ہے اور میں بادشاہ ہوں، حضرت عمرؓ
جمعك واياه، فلست تفضله	نے فرمایا کہ اسلام نے دونوں کو برابر کردیا
بشيئ الا با لتقوى[1]	ہے تم کو تقویٰ کے علاوہ اور کسی ذریعہ
	سے اس پر فضیلت نہیں ہوسکتی،

حالات و زمانہ کی تصویر کشی،

حالات و زمانہ کی تصویر کشی اور اشخاص کی مرقع نگاری اصبہانی کا خاص موضوع ہے، آغانی اس کا نمونہ ہے، اس کی تاریخی حیثیت جیسی بھی ہو مگر بحیثیت مجموعی اس دور کے حالات کی جیسی تصویر اس میں نظر آتی ہے، کسی کتاب میں نہیں مل سکتی،

یوں تو پوری کتاب الاغانی اس حقیقت پر شاہد ہے، لیکن اگر عوام کی ذہنیت

[1] مقاتل الطالبین لابی الفرج الاصبہانی، ص ۴۰۴ معارف جبلہ بن ایہم شام کا مشہور رئیس و حکمران تھا، وہ مسلمان ہو گیا تھا کعبہ کے طواف میں اس کی چادر کا کونہ ایک شخص کے پاؤں کے نیچے آگیا، جبلہ نے اس کے منہ پر تھپڑ مارا اس نے بھی ایک تھپڑ رسید کیا جبلہ بے تاب ہوگیا اور حضرت عمرؓ کے پاس جاکے اس کی شکایت کی انھوں نے شکایت سنکر فرمایا، اس میں شکایت کا موقع نہیں ہے تم نے اپنے کئے کی سزا پالی، اس کو سخت حیرت ہوئی، اس نے کہا ہم اس رتبہ کے لوگ ہیں کہ جو شخص ہم سے گستاخی سے پیش آئے اسکی سزا قتل ہے حضرت عمرؓ نے فرمایا بیشک جاہلیت میں ایسا ہی تھا، لیکن اسلام نے بلند و پست کو ایک کر دیا اس نے کہا اگر اسلام ایسا مذہب ہے جس میں شریف اور ذلیل کی تمیز نہیں، تو میں اسلام سے باز آیا اور چھپ کر قسطنطنیہ بھاگ گیا"

حضرت عمرؓ کا جواب مختلف کتابوں میں مختلف الفاظ میں منقول ہے، مگر مفہوم و منشا سب کا ایک ہے،

ونفسیات کی تصویر دیکھنی ہو تو عقلیۃ العامۃ[1]، بنی امیہ کے راگوں اور نغموں کا علم مطلوب ہو تو غناء دمشق، اور ملوک غسان کے دربار دن کا جاہ و جلال دیکھنا ہو تو۔ مجالس ملوک غسان[2] کے حالات دیکھے جائیں تو اس سے ابوالفرج کی مرقع نگاری اور ادیبانہ تصویر کشی کا بخوبی اندازہ ہو جائے گا،

تنقید نگاری، | ابوالفرج نے ادبی تنقید میں بھی اپنی عبقریت اور تنقیدی بصیرت کا ثبوت دیا ہے۔ ابو تمام کی شاعری اور اس کی خصوصیات پر ان الفاظ میں تبصرہ کرتا ہے۔

ابوتمام شاعر مطبوع، لطیف الفطنۃ، دقیق المعانی
غواص علی ما یستصعب منها ویعسر متناوله علی غیرہ

بحتری کے متعلق لکھتا ہے

البحتری شاعر فاضل حسن المذهب، نقی الکلام مطبوع
وله تصرف حسن فاضل نقی فی ضروب الشعر سوی الهجاء"

ابن المعتز کی تحسین و مدافعت میں البتہ وہ نقاد سے زیادہ سوانح نگار معلوم ہونے لگتا ہے۔ اس کے علم و فضل پر بحث کرتے ہوئے اس کے مخالفین کے جواب میں لکھتا ہے

ممن صنع من اولاد الخلفاء فأجاد و أحسن و برع وتقدم فی
جمیع أهل عصرہ فضلا وشرفا وأدبا وشعرا وظرفا وتصرفا
سائر الآداب ابو العباس ابن المعتز باللہ"[3]

ابن المعتز کے بارہ میں یہ رائے عادلانہ اور حقیقت پر مبنی ہے۔ جیسا کہ دوسرے

---

[1] الاغانی ج ۱۲ ص ۴، [2] الاغانی ج ۱۲ ص ۱۳، [3] ایضاً ج ۹ ص ۱۳۳

نقادوں نے بھی لکھا ہے، بحیثیت مجموعی ابوالفرج کی تنقید میں بڑا اعتدال و توازن ہوتا ہے، تنقید ادب ہو یا تنقید سماج، اس کی تنقیدیں افراط و تفریط اور انتہا پسندی سے پاک ہوتی ہیں،

اصبہانی کا اسلوب نگارش | واقعات کی روایت میں ابوالفرج اصبہانی نے محدثین کا طرز اختیار کیا ہے، جو اس دور میں مقبول عام تھا، چنانچہ ان ہی کی طرح روایت میں معنعن سلسلے (عن فلان بن فلان) کا اہتمام، اغانی اور مقاتل الطالبین دونوں کتابوں رکھا ہے۔ البتہ اسناد کی صحت اور رواۃ کی جرح و تعدیل کی ذمہ داری اپنے اوپر نہیں رکھی ہے۔

مقاتل الطالبین میں کبھی کبھی بعض رواۃ کی خامیوں کی طرف اشارہ کر جاتا ہے، مثلاً ایک جگہ علی بن محمد النوفلی کی روایات کو بیکار محض اور فوادہ (اراجیف اباطیل و اباطیل) قرار دیا ہے، اس کی وجہ یہ بتائی ہے کہ اس کی تمام روایات اس کے والد سے موقوفاً مروی ہیں، جو اس سے بہت دور کوفہ سے بہت پہلے جا چکے تھے۔

"واکثر حکایاته فی ذالك بل سائرها من أبیه موقوفا علیه
لا یتجاوزہ وأبوہ حینئذ مقیم بالبصرۃ لا یعلم بشئی من
أخبار القوم إلا ما یسمعه من السنة العامة علی سبیل الأراجیف
والأباطیل"[1]

مفرد الفاظ اور فقرے نہایت چست، برمحل، موزوں اور رچے تلے استعمال کرتا ہے، زبان سلیس اور ترکیبیں شگفتہ ہوتی ہیں، جو ہر دور میں مقبول رہی ہیں، حتی کہ

---

[1] مقاتل الطالبین للاصبہانی ص ۴۱۵،

آج بھی ان کا رنگ پھیکا نہیں پڑا۔ اور اہل قلم اپنی تحریروں میں اس کو استعمال کرتے رہتے ہیں
یہی وجہ ہے کہ اغانی اپنے موضوع اور زبان وبیان کے اعتبار سے ہر دور میں بے مثال
اور سدا بہار رہی ہے، اور آج بھی ہے،

الفاظ اور زبان پر اس کو اتنی قدرت ہے کہ چند الفاظ اور فقروں میں مطلوب
چیز کا پورا نقشہ کھینچ دیتا ہے، مثلاً غیظ وغضب کا بیان ان الفاظ میں کرتا ہے،

"فتربد وجهه وجحظت عيناه وهم بالوثوب"
"فخفق كما يخفق الطائر فاضطرب اضطراب العصفور
فخيل الى ان الشجرة تنطق"[1]

کتاب الأغانی کی قدر وقیمت، "الاغانی" عربی ادب کا شاہکار ہے، اور ادب انشا
کا سرچشمہ ہے۔ اس کی قدر وقیمت کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ ابو الفرج نے کتاب
مکمل کرنے کے بعد سیف الدولہ کے حضور میں پیش کی وہ اس وقت رومیوں سے
جنگ کی تیاری میں مشغول تھا، اس نے ایک ہزار دینار دیئے اور معذرت کی کہ
عجلت کے باعث اس کی پوری قدر نہ کرسکا۔

یہ خبر جب نامور انشا پرداز صاحب بن عباد کو پہنچی تو اس نے کہا سیف الدولہ
نے ناقدری کی، ابو الفرج تو اس سے کہیں زیادہ کا مستحق تھا، اغانی کے قابل رشک
محاسن اور نپے تلے فقروں کا حریف کون ہوسکتا ہے، یہ الفاظ اور فقرے زاہد کے لیے
مایہ تفریح، عالم کے لیے معلومات کا خزانہ، انشا پرداز اور جویائے ادب کے لیے
سرمایہ تجارت بہادر کے لیے ہمت وشجاعت کی ڈھال، ظریف کے لیے ریاضت

[1] الاغانی ج ۱ ص ۱۰۲

وصناعت، بادشاہ کشور کشا کے لئے سامان سرور ولذت ہیں، میرے کتب خانہ میں
ایک لاکھ سترہ ہزار کتابیں ہیں، مگر اغانی سے بڑھ کر میری انیس کوئی کتاب نہیں،[1]
صاحب بن عباد نے یہ بھی کہا کہ کوئی بھی چیز ایسی نہیں ہے، جس کی مجھے جستجو رہی ہو
اور اغانی میں نہ مل گئی ہو۔ جو واقعات علماء نے بہت سی کتابوں میں لکھے ہیں وہ سب
اس میں حسن تالیف اور لطف بیان کے ساتھ موجود ہیں، سیف الدولہ سفر وحضر میں
اس کتاب کو ہر وقت اپنے ساتھ رکھتا تھا۔ کہتے ہیں، اس کا ایک مسودہ بغداد میں
چار ہزار درہم میں فروخت ہوا تھا۔

صاحب نفح الطیب کے حوالہ سے بطرس بستانی نے لکھا ہے کہ اندلس کے اموی
خلیفہ حاکم مستنصر نے اغانی کو محض دیکھنے کے لیے ایک ہزار دینار بھیجے تھے۔ حکومت مروانیہ
کے فرمانروا الحکم بن ناصر کے بارے میں بھی اسی طرح کی روایت بیان کی جاتی ہے، اس نے
بھی ایک ہزار دینار صاحب اغانی کو محض اس کتاب کے دیکھنے کے لیے عنایت کئے تھے
تاکہ وہ عباسی خلفاء سے پہلے اس کو دیکھ لے۔[2]

اغانی کی حیثیت — ادبی یا تاریخی؟ جس دور میں یہ کتاب لکھی گئی ہے۔ اس دور میں
جہاں ایک طرف ارباب اقتدار عیش وعشرت کی سرمستیوں میں مبتلا تھے، دوسری طرف
اس کی قدردانی اور علم نوازی سے علماء اور ادباء، حدیث، تاریخ، اسماء الرجال
اور ادبیات کی تدوین وتالیف میں ہمہ تن مصروف تھے، یہ دونوں رخ مستند تاریخی
کتابوں میں دیکھے جاسکتے ہیں، اس لیے یہ دور اگر عیش پرستی کا گہوارہ تھا تو علوم وفنون
کا بھی عہد زرین تھا۔

[1] بطرس البستانی: اُدباء العرب فی الاعصر العباسیۃ، ص ۲۱۷، [2] ابو الفضل تاریخ ادبیات عربی
ص ۱۵۷

فن حدیث، تاریخ اور اسماء الرجال کی وجہ سے نقل روایت کا ایک خصوصی نہج قائم ہو گیا تھا۔ اور ہر واقعہ سلسلہ اسناد و رواۃ کے ساتھ پیش کیا جاتا تھا، اس کے بغیر کوئی کتاب مشکل ہی سے قابلِ توجہ بنتی تھی اس لئے اغانی بھی اسی اسلوب میں لکھی گئی لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ معنعن سلسلہ سے (عن فلان ابن فلان انہ قال کے انداز پر) جو حکایت بھی نقل کر دیجائے، وہ لازمی طور پر مستند و معتبر بھی ہو، مستشرقین کو اس اسلوبِ نگارش سے غلط فہمی ہوئی، اور انھوں نے اغانی کی تمام روایات کو مستند مان لیا، جوزیف ہیل کی کتاب عربوں کا تمدن، اسی غلطی کا ایک نمونہ ہے، انھوں نے اغانی کی حکایات و روایات کی بنیاد پر تاریخ عرب سے متعلق مستقل نظریے قائم کر لیے جوزیف ہیل کی یہ کتاب جب شائع ہوئی تو مولانا سید سلیمان ندوی نے معارف میں اس کی تردید کی اور لکھا کہ "مولانا عبد الحلیم شرر کے اکثر دلچسپ تاریخی مضامین اسی کتاب الاغانی ہی سے ماخوذ ہیں، جنھیں اہل علم نے کبھی بھی مستند تاریخ تسلیم نہیں کیا۔[1]

جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے، صاحب الاغانی ابو الفرج اصبہانی بڑا زندہ دل اور رنگین مزاج تھا اسکی ساری زندگی رنگین مشاغل میں گذری ہر وقت لہو و لعب میں مبتلا رہتا تھا، اس کی تصانیف کا مرکزی موضوع علم انساب، شعر و سخن میخوارں عاشقوں، گویوں،... اور گانے والیوں، راگ راگنیوں اور ان میں مست رہنے والوں کے حالات و واقعات ہیں۔ اس سلسلہ میں اسکو خلفا، وزراء اور عمال، اور ان کے تفریحی مشغلوں سے زیادہ دلچسپی تھی، جو اغانی کے ہر صفحہ سے نمایاں ہے، اس نے اس کتاب میں شعراء، امراء اور دیگر مشاہیر کے صرف وہی واقعات و حالات

---

[1] معارف اعظم گڈھ ۱۹۳۰ء (ملخصاً و مختصراً)

نقل کئے ہیں، جو اس کے ذوق سے ہم آہنگ اور دل بہلانے کا سامان فراہم کرتے ہیں اخلاقی پستی کے اظہار میں اسے کوئی جھجھک نہیں ہوتی۔ حالانکہ انھیں شخصیات کے اخلاقی محاسن بھی بیان کئے جا سکتے تھے اسی بنا پر جرجی ازیدان اور طہ حسین نے یہ سمجھ لیا کہ پورا عباسی دور فسق و فجور کا عہد تھا، اور اس زمانہ میں عوام، خواص، علماء اور امراء سب اخلاقی پستی کے دلدل میں پھنسے ہوئے تھے، جو سراسر غلط ہے اس دور میں اگر ایک طرف عیش و نشاط کی سرمستیاں تھیں تو دوسری طرف علمی و تمدنی ترقی کا دورِ شباب تھا، اس پر بحث کرتے ہوئے کہ اغانی کس قسم کی کتاب ہے، ؟ ڈاکٹر ذکی مبارک لکھتے ہیں[1] کہ اغانی کے مقدمہ پر نظر ڈالنے سے اس کی اہم خصوصیات خود بخود واضح ہو جاتی ہیں، "اغانی خود لکھتا ہے،

کتاب کے ہر فصل میں کچھ نہ کچھ ایسا مواد مہیا کیا گیا ہے جو اہلِ ذوق کی تفریح کا سامان بن سکے۔ اس میں سنجیدہ واقعات بھی ہیں، اور خرافات بھی ایامِ عرب کے قصص بھی ہیں اور مستند تاریخی واقعات بھی، شاہان عرب اور خلفاء اسلام کے افسانے بھی ہیں، اور شعراء و ادباء کے ظریفانہ قصے بھی ہو سیقی جسقدر راگ لکھے گئے ہیں ان میں سے بیشتر کے متعلق کوئی نہ کوئی ایسا افسانہ ضرور ہے، جو لوگوں کے ہنسنے ہنسانے کا کام دے،

لیکن ہر لحن کے ساتھ اس کا التزام نہیں ہے۔ اور جو واقعات نقل کئے گئے ہیں ضروری نہیں ہے کہ وہ نتیجہ خیز بھی ہوں اور اگر نتیجہ خیز ہوں تو ضروری نہیں کہ سامعین کے لئے دلچسپ بھی ہوں جس سے اہل ذوق محظوظ ہو سکیں۔

---

[1] مجلة "المقتطف" (مصر) جولائی ۳۰ء (بحوالہ معارف ج ۲۶ شمارہ ۳)

اصبہانی کے یہ الفاظ اس کا ثبوت ہیں کہ واقعات کے انتخاب میں صرف اس کا لحاظ رکھا گیا ہے، کہ وہ دلچسپ ہوں اور گرمیٔ محفل کا سامان بن سکیں، اس لئے ان تفریحی ظرافت آمیز مرویات کو تاریخی واقعات کی طرح مستند سمجھنا خود اپنی غلطی ہے اگرچہ اغانی کے مندرجات مسلسل سند سے مروی ہیں، لیکن یہی سلسلہ اسناد سب سے زیادہ فریب دہ ہے، حقیقت یہ ہے کہ اسناد کے خوبصورت سلسلہ کے باوجود رواۃ اور اسناد دونوں نہایت کمزور ہیں، اور ان میں بڑا تضاد و تناقض ہے۔ اشخاص کے سوانح نہیں بلکہ حالات و زمانہ کی تصویر کشی اور ادبی لطائف کو پیش کرتا ہے، اس کے لئے واقعات کی صحت ضروری نہیں اصبہانی خود بھی ان حکایات کے تاریخی پایہ کی طرف اشارہ کرجایا کرتا ہے، مثلاً کہیں حدیث غریب کہیں حدیث حلو، اور کہیں "واقعہ جیسا کہ مجھ تک پہنچا ہے" لکھتا ہے،

مشہور عیسائی ادیب بطرس بستانی کی رائے بھی یہی ہے، وہ لکھتے ہیں۔

کہ "ابو الفرج طالب لذت تھا، اس کی کتاب کی بنیاد موسیقی پر ہے، اور موسیقی کا مقصد حصول لذت ہے، اس لئے اس کی کتاب میں لغویات اور فسق و فجور کی باتوں کا غلبہ ہے، اور وہ رکیک نوادر سے بھری ہوئی ہے، وہ شعراء، ان کے حالات اور اس کی فحش اشعار اور اخلاقی پستی کو نمایاں کرتا ہے، اور خلفاء، ان کی اولاد، ان کی عورتوں کو بھی نہیں چھوڑتا، ان کے عشق، ان کی خرابانی زندگی اور لہو و لعب شراب و کباب اور رنگ رلیوں کا ذکر کرتا ہے، اس لئے ہم تاریخی حیثیت سے اغانی پر اعتماد نہیں کرسکتے، خصوصاً اسلامی اور مولدین کے بارہ میں کیونکہ

ان کا ذکر وہ عموماً تفریح اور لہو و لعب کے لیے کرتا ہے، اس لئے اس کی تمام روایات کو قبول نہیں کیا جاسکتا، البتہ بعض روایتیں احتیاط کے ساتھ قبول کیجا سکتی ہیں"

اس بحث کا حاصل یہ ہے کہ اغانی ادبی لطائف کا مجموعہ ہے، جس سے ذوق ادب کو تسکین ہوتی ہے، لیکن وہ کوئی مستند تاریخ نہیں، اس کے باوجود وہ اس دور کی سوسائٹی کے ایک رخ کی تصویر ہے، جس کو افسوسناک تو کہا جاسکتا ہے، لیکن نظر انداز نہیں کیا جاسکتا اور وہ موسیقی، اور شعر و ادب اور نوادر و لطائف کا بیش بہا سرمایہ ہے،

خواجہ عزیز کی شاعری

از۔ جناب سید ضیاء الحسن صاحب استاد فارسی مجیدیہ اسلامیہ کالج الہ آباد

(۲)

خواجہ صاحب کا دیوان اگرچہ بہت زیادہ ضخیم نہیں ہے تاہم وہ تقریباً دو سو غزلوں، بیس سے زیادہ قصائد، چار مختصر مثنویوں اور دیگر اصنافِ سخن مثلاً تاریخی قطعات، مرثیے، ترکیب بند، رباعیات اور ہفت بند وغیرہ پر مشتمل ہے،

یہ دیوان پہلی اور آخری بار شاہی پریس لکھنؤ میں ۱۹۳۱ء میں شائع ہوا جو عام طور پر دستیاب ہوتا ہے۔ اور ۲۰ × ۲۶ سائز کے ۴۳۴ صفحات پر حاوی ہے، ہر صفحہ میں ۱۴ سطریں ہیں اس کے مرتب خواجہ صاحب کے بڑے صاحبزادے خواجہ وصی الدین صاحب (ڈپٹی کلکٹر لکھنؤ) ہیں دیوان کے آخر میں خواجہ صاحب کے کچھ خطوط بھی شامل ہیں جو انھوں نے اپنے عہد کے مشاہیر کو لکھے تھے، جن سے فارسی نثر پر ان کی قدرت اور برجستگی کا اندازہ ہوتا ہے۔

اگلے صفحات میں ہم انشاءاللہ تمام اصنافِ سخن کا الگ الگ جائزہ لینے کی کوشش کریں گے، سب سے پہلے غزل پر تبصرہ کیا جاتا ہے،

خواجہ صاحب کی شاعری حشو و زوائد سے پاک ہے، مضامین میں لطافت اور

دلکشی کے ساتھ ساتھ پاکیزگی ہے۔ لکھنؤ میں اس زمانے میں شاعری کا جو رنگ تھا، اور اس میں جو سطحیت پیدا ہو گئی تھی۔ اُن کا کلام اس سے پاک ہے، ان کے یہاں گیرائی بھی ہے اور گہرائی بھی۔ زبان صاف، سادہ اور رواں، طرزِ ادا دلکش، متین اور شیریں ہے۔ کہیں کہیں آورد بھی ہے، لیکن جہاں اشعار کا ورود کثرت سے ہوا ہے، وہاں آمد کا لطف قابلِ دید ہے جو روانی ایسے اشعار کی جان ہے۔

صوفیانہ شاعری

خواجہ عزیز صوفی منش انسان تھے اس لئے ان کی غزلوں میں حسن و عشق کے جذبات صوفیانہ انداز میں بیان ہوئے ہیں۔ وہ خود فرماتے ہیں۔ ؎

ما عاشقیم عشق بود کارِ ما عزیز — عاشق پسند ہست ہمانا کلامِ ما

عشق کا جذبہ ان کے نزدیک بہت بلند ہے جو بڑی ریاضت سے پیدا ہوتا ہے اور ہر ایک کے بس کا نہیں۔ وہ عشق "موئے میان" سے زیادہ باریک اور بے انتہا پُر خطر ہے ؎

منزلِ عشق کہ از دیدہ نہانست اینجا — راہ باریک تر از موئے میانست اینجا

جہاں عشق میں اس جذبے کی کارفرمائی ہوگی وہ ہوا و ہوس سے پاک اور مجاز سے الگ عشق حقیقی ہی ہو سکتا ہے۔ یہ وہ آگ ہے جو عاشق کو اندر ہی اندر جلاتی رہتی ہے اور اسے محسوس نہیں ہوتا ؎

تمام سوختم و ایں قدر ندانستم — کہ دل برائے چہ ہمچو کباب می سوزد

حقیقی عشق کی قدر و منزلت ان ہی کے الفاظ میں ملاحظہ فرمائیے۔

یک جرعہ کند زندہ بسے مردہ دلاں را — در ساغرِ ما چیست اگر آبِ بقا نیست

اسکا ایک گھونٹ مردہ دلوں میں جان ڈال دیتا ہے، اس لئے اگر میرے ساغر میں آبِ حیات نہیں ہے تو پھر کیا چیز ہے۔

اپنے عشق میں. مصائب بھی پیش آئیں ان کو برداشت کرنا چاہیئے۔

بدشت عشق مکن لعطش عزیزؔ خموش چہ ذکر آب کہ ایں جا سراب نماند

عشق کا یہ مقام یا معرفت الٰہی نقش ہستی کو مٹانے سے ملتا ہے۔

چاک کن جامۂ ہستی کہ شود او پیدا تاگریباں ندرد گل نہ کند بو پیدا

جامۂ ہستی کو چاک کر دو تب وہ ملے گا پھول جب تک گریباں نہیں پھاڑتا بو نہیں پیدا ہوتی،

چاک درون سینۂ من کے شود درست صد سال اگر ز سوزنِ عیسیٰ رفو کنم

یہ چاک وہ ہے جس کو سوزن عیسیٰ بھی رفو نہیں کر سکتا

ز داغ سینہ رسد فیض جملہ اعضا را یک آفتاب بود بس تمام دنیا را

سالک کے "سینہ کا داغ" کا فیض سارے اعضا کو پہنچتا ہے، جس طرح ایک آفتاب

ساری دنیا کو روشن کر دیتا ہے،

یہ عشق آسانی سے پیدا نہیں ہوتا اس کے لئے جاں گدازی اور خون جگر پینے کی

ضرورت ہے، ؎

عشق بازی در حقیقت جانگدازی بودہ است عمرہا خوں خوردہ ام ایں مے نہ آساں خوردہ ام

عشق بازی در حقیقت جانگدازی کا نام ہے، اس شراب کو آسانی سے نہیں پیا ہے بلکہ برسوں خون جگر

پینا پڑا ہے،

شرح دل من جز تو حکیمی نتواں کرد مجموعۂ عشق است اشارات و شفا نیست

میرے دل کی شرح تیرے سوا کوئی حکیم نہیں کر سکتا کیونکہ یہ عشق کا مجموعہ اشارات و شفا نہیں ہے،

شفا، بو علی سینا کی کتاب ہے، اور اس کی شرح اشارات محقق طوسی کی تصنیف ہے،

وہ محبوب حقیقی کا ظہور کائناتِ عالم کی ہر شے میں دیکھتے ہیں مگر اس کے اوصاف

بیان کرنے سے قاصر ہو جاتے ہیں، ؎

بچہ اسباب کند وصف تو بیہمات عزیزؔ نہ دہانے نہ زبانے نہ بیانے دارد

افسوس عزیزؔ کن وسائل سے تیرے اوصاف بیان کرے اس کے بیان کرنے کے لیے نہ منہ ہے،

نہ زبان ہے، نہ قوت بیان ہے،

دنیا کی ہر شے اس کا ایک بیان ہے، مگر گوش ہوش نہیں جو اسے سن سکے ؎

گوش گل طاقتِ افسانہ ندارد بلبل ورنہ ہر خار زبانے و بیانے دارد

ان کی غزلوں میں بے ثباتی دنیا، دنیاوی جاہ و حشمت سے بے نیازی، زندگی

کی بے اعتباری وغیرہ کے مضامین بکثرت ملتے ہیں، اس کا ایک نمونہ ملاحظہ ہو۔

اعتبارے نبود بر سر و سامان جہان بیش من بے سر و ساماں سر و ساماں دارد

کجا ایں ساغر و مینا بفردا دسترس باشد غنیمت داں عزیزؔ امروز دور گرم محفلہا

قصر شاہی نرسد کلبۂ درویشی را کہ گدائے در او نازِ بخاقاں دارد

مند بلبل شید اور یں چمن دل را جہان پر خس و خاشاک آشیانہ کیست؟

کلام عزیزؔ کی اس حقیقت کا اعتراف علامہ اقبال نے بھی کیا ہے وہ لکھتے ہیں،

"غزل میں ان کی نظر بیشتر روحانی حقایق پر رہتی ہے اور اُن حقایق کو وہ

نہایت آسانی سے اور لطافت کے ساتھ ادا کر جاتے ہیں۔ مثلاً" ؎

دو غنچہ ہست دو عالم ز گلشن صنعش یکے شگفتہ یکے ناشگفتہ است ہنوز

مسائل تصوف کے ساتھ ساتھ اخلاقی مضامین خواجہ صاحب کی شاعری کا اہم

عنصر ہیں، اور شیخ سعدی اور خواجہ حافظ کی اخلاقیات کی جزئیات پر۔۔۔۔ گہری نظر ہے،

ہرگز بزیر سایۂ احسان نمی روم | جاں می دہم بچشمۂ حیواں نمی روم

میں کسی کا زیر بار احسان ہونا پسند نہیں کرتا جان دیدیتا ہوں مگر چشمۂ حیواں تک نہیں جاتا۔

ہمیں بس است بہمت کہ در تہیدستی | دراز پیش کسے نیست دست حاجت ما

ہرگز بسوئے محتشمان، من نمی روم | لب تشنہ جاں دہم و بدریا نمی روم

ہمت کے لیے اتنا کافی ہے کہ تہیدستی میں بھی میرا ہاتھ کسی کے سامنے نہیں پھیلتا اور میں کسی صاحب دولت و وجاہت کے پاس مدد کے لیے نہیں جاتا تشنہ لب جان دیدیتا ہوں مگر دریا کے پاس نہیں جاتا۔

گزشت قافلہ و ماہنوز در خوابیم | تباہ در دو جہاں خانماں غفلت ما

بری صحبت سے گریز کرنا چاہئے کہ سوسائٹی کا اثر انسان بہت جلد قبول کر لیتا ہے،

ہم نشینے نیک خصلت شو زبد خوباں گریز | آشنا با آشنا بیگانہ با بیگانہ باش

"با دوستاں تلطف بادشمناں مدارا"، کا تصور خواجہ عزیز کی غزلوں میں نظر آتا ہے۔

در طریق ما بدشمن مہربانی خوش بود | جائے در پہلو دہد سیلاب را دیوار ما

ہمارے مسلک میں دشمن کے ساتھ مہربانی سے پیش آنا چاہئے چنانچہ ہماری دیوار اپنے پہلو میں سیلاب کو جگہ دیتی ہے،

والکاظمین الغیظ کی ترجمانی اس طرح کرتے ہیں،

مے نشاط کشیدن ہمیشہ عادت ما | شراب غصہ حرام است در شریعت ما

انسان اس دنیا میں کیا مقصد لیکر آیا تھا، لیکن یہاں پہنچ کر کن چیزوں میں گرفتار ہو گیا،

از عدم آمدہ بودم پے گلگشت جہان | دام گیسوئے کسے کرد گرفتار مرا

ہم عدم سے دنیا کی سیر کیلئے آئے تھے، لیکن یہاں کسی کے گیسو نے گرفتار کر لیا،

از عدم آمدہ بودم پے تفریح بدہر | چہ بلا آب و ہوا بود کہ بیمار شدم

ہم دنیا میں سیر و تفریح کے لیے آئے تھے، لیکن یہاں کی آب و ہوا ایسی خراب تھی کہ بیمار ہو گئے،

جو سالک ہمت سے کام لے تو بھنور میں پھنسی ہوئی کشتی بہ آسانی پار لگ سکتی ہے۔

رہروانے کہ براہ ہمت کمر دل بستند | کشتیٔ خویش از بحر بساحل فگنند

تیری راہ کے جو راہرو دل سے کمربستہ ہوتے ہیں، وہ اپنی کشتی ساحل تک پہنچا دیتے ہیں۔

وہ اقبال کی طرح مرغ ہمت کو بلند پروازی کی تعلیم دیتے ہیں۔

زشاہباز جفائے فلک چہ می ترسی | تلاش قوت کن اے مرغ زآشیاں برخیز

تو شاہباز فلک کی جفا سے کیوں ڈرتا ہے، اپنا آشیانہ چھوڑ کر اپنی روزی تلاش کر،

فقر خاک راہ و دولت افسر اقبال بود | آں بفرق خویشتن ایں بسر دار نہ دم

اس کی ہمت یہ ہے کہ فقر کو خود اختیار کیا، اور دولت و اقبال کو دارا کیلئے چھوڑ دیا،

اس رنگ کے کچھ اور اشعار ملاحظہ ہوں،

طوفاں اگرچہ خیزد از بحر غم چہ پروا | کشتی بہ ہیئے روان کن ساقی چو ناخدا ست

ہمت از دوست طلب کن کہ ز گلشن شبنم | بہ مددگاریٔ خورشید درخشاں برخاست

عشقیہ شاعری

خواجہ عزیز کی عشقیہ شاعری پاکیزہ تغزل کا اعلیٰ نمونہ، اور زبان و بیاں کی فصاحت و سلاست کے ساتھ تخیل کی بلندی و پاکیزگی سے معمور ہے، اس کے کچھ نمونے ملاحظہ ہوں،

چشمان تو بے شراب مستند | حاشا من و از تو بدگمانی

تیری آنکھیں بے پئے مست رہتی ہیں، مگر تجھ سے بدگمانی نہیں کرتا۔

اردو کے مشہور شاعر میر تقی میر نے کہا تھا ؎

سخت کافر تھا جس نے پہلے میرؔ　　مذہبِ عشق اختیار کیا

خواجہ صاحب فرماتے ہیں۔

نیست خالی از خیالِ زلفِ رعنایاں سرے
ایں بلا از عالمِ بالا کجا نازل نہ شد

یعنی ہر شخص گرفتار محبت ہے، گویا محبت بھی اک "بلائے ناگزیر" ہے، جو "عالم بالا" سے نازل ہوئی ہے، اس لئے اس سے کوئی بھی نہیں بچ سکتا۔

نہ تبسم نہ تکلم نہ ادائے ز صنم　　حیرتم ہست کہ چوں بُرد دل از برہمنان

بت نہ ہنستے ہیں نہ بولتے ہیں، نہ ان میں کوئی ادا ہے، حیرت ہے کہ انھوں نے برہمنوں کے دل پر کس طرح قبضہ کر لیا۔

در حیرتم ز غمزہ و ناز و کرشمہ اش　　ہر شیوہ دلفریب بود دل کرا دہم

محبوب کی ہر ادا دل ربا ہوتی ہے، کس کس کو دل دیا جائے،

نشاط وصل تو محروم دارم از وصل　　کہ در کنار چو آئی ز خود کنارہ کنم

محبوب کے وصال سے بھی لذت وصال سے اس لئے محرومی رہتی ہے کہ جب وہ آغوش میں آتا ہے تو عاشق ہوش و حواس کھو بیٹھتا ہے،

بوئے گل نیست کہ آید ز چمن در کویت　　ناتوانان تو بر دوش صبا می آیند

تیرا عاشق پھول کی بو نہیں ہے، جو چمن سے تیری گلی میں آجائے بلکہ اس کی ناتوانی اس کو دوش صبا کے سہارے لاتی ہے،

وصف گلہا بر خوباں بہ نزاکت مکنید　　کہ بود باعثِ آزردن نازک بدنان

حسینوں کے سامنے پھولوں کی تعریف نزاکت سے نہ کرو کہ اس سے نازک بدنوں سے آزردگی ہوتی ہے،

نہ غمزۂ نہ پری نے کرشمۂ از حور　　چگونہ بے تو تسلی کند کسے مارا

نہ پری میں کوئی غمزہ ہے نہ حور میں کوئی کرشمہ ہے، اس لئے کوئی شخص تیرے بغیر میری تسلی کس طرح کر سکتا ہے،

ببیں آں روئے و موئے و خط و خال و چشم و ابرو را
بدل دادن چہ می پرسی ز اسبابے کہ من دارم

محبوب کے چہرہ، بالوں، خط و خال اور چشم و ابرو کو دیکھو دلربائی کے اتنے سامانوں کے ہوتے ہوئے دل دینے کے سامان کو کیا پوچھتے ہو؛

خوشم کاے بیوفا ناخواندہ کردی چاک مکتوبم
بمعنوئے کہ حرفِ مدعا فہمیدہ ٔ گویا

مجھے اس سے خوشی ہے کہ تجھ بے وفا نے اس طرح میرا خط بے پڑھے ہوئے چاک کر دیا ہے گویا میرے مدعا کو سمجھ گیا ہے،

شب آخر است و نیامد ہنوز یار عزیز
مگر بخواب در آید بنای خواب انداز

عزیز رات آخر ہو گئی، اور محبوب ابھی تک نہیں آیا شاید خواب میں آئے اس لیے سو جانا چاہئے۔

مثنویات: شاعری کی دوسری اصناف کے مقابلہ میں مثنوی کا میدان بہت وسیع ہے، کیونکہ اس صنف میں اتنی شرطیں اور قیدیں نہیں ہیں، جتنی دوسری اصناف غزل، قصیدہ اور رباعی وغیرہ میں ہیں۔ پھر بقول حالیؔ "کوئی صنف مسلسل مضامین بیان کرنے کے قابل مثنوی سے بہتر نہیں ہے۔"[1] آگے چلکر وہ لکھتے ہیں کہ "یہی وہ صنف ہے جس کی وجہ سے فارسی شاعری کو عرب کی شاعری پر ترجیح دی جا سکتی ہے۔"[2]

اس صنف میں ربط کلام کا لحاظ رکھنا نہایت ضروری ہے۔ علمائے بلاغت نے مثنوی میں مبالغہ کو صنائع معنوی اور محسناتِ کلام میں شمار کیا ہے، اسی طرح مثنوی میں اس کا بھی خیال رکھنا چاہئے کہ کلام مقتضائے حال کے مطابق ہو۔ ان شرائط اور خصوصیات کی روشنی میں خواجہ عزیزؔ کی مثنویات کا سرسری جائزہ لیا جاتا ہے۔

مثنوی ید بیضاو: مولانا حبیب الرحمٰن خان شروانی لکھتے ہیں، "یہ مثنوی امین شیرازی کی مشہور مثنوی سحر حلال کا جواب ہے۔"[3] یا تو شروانی صاحب مصنف سحر حلال کا نام سہواً امین شیرازی لکھ گئے ہیں۔ یا ممکن ہے۔ "سحر حلال" کے مصنف کا تخلص "اہلی" اور نام امین شیرازی رہا ہو۔ جس کا علم مجھ کو اب تک نہ ہو سکا۔

"سحر حلال[4] کے مصنف کا تخلص "اہلی" ہے۔ انکا سنہ پیدائش تو معلوم نہیں۔

---

[1] و [2] مقدمہ شعر و شاعری ص ۸۰ شائع کردہ ادارہ فروغ اردو۔ لکھنؤ (مطابق نصاب بی۔ اے)

[3] مقدمہ دیوان خواجہ عزیز۔ ص ۱۲، [4] سحر حلال۔ د ۔ در دو دالسحار" نامی ایک دوسری مثنوی ۱۸۹۱ء میں مطبع اثنا عشری میں سید عابد علی صاحب کی نگرانی میں شائع ہوئی۔ یہ مختصر مثنوی صنعت مہملہ کی بہترین مثال ہے، جو تقریباً ۴۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کے عنوانات یہ ہیں۔ حمد کردگار۔ در مدح داماد رسول۔ در مدح آل رسول۔ در مدح حاکم ممدوح۔ در مدح حاکم کامگار۔ در مدح حاکم عصر۔ در مدح حاکم عصر و مالک دھر

انتقال ۹۴۰ھ ۱۵۳۵ء میں ہوا۔ یہ مشہور فارسی گو شاعر تھے۔ خراسان کے دار الحکومت شیراز میں عرصہ تک قیام رہا۔ مثنوی سحر حلال کے علاوہ اہلی شیرازی کی کئی اور تصنیفات مثلاً "شمع و پروانہ" "ساقی نامہ" رباعیات اور ایک کلیات جس میں قصائد، غزلیات،

(بقیہ حاشیہ ص ۲۹۰) ممسک کردگار۔ در احوال یوم طول اکل۔ در احوال در و دلدار۔ در حمد کردگار۔ در محل دعا۔ وغیرہ اور اسی سبق پر مثنوی کا خاتمہ ہے۔ حمد کی ابتدا ان اشعار سے ہوتی ہے۔ ع

حمد مر کردگار عالم را	کہ دہد راح و روح آدم را
حاکم و عادل و سلام حمد	واحد و واسع و ودود واحد

"در محل دعا" یعنی آخری سبق کی ابتدا کا شعر یہ ہے۔ ع

کردگارا راہ را گم کردہ ام

در ہوا و حرص رُو آوردہ ام

اس سبق کا اختتام یوں ہوتا ہے۔ ع

طلوع لوامع در اطوار او	لموعِ طوالع در اسرار او
حدودِ ہُدارا مُوَلّدہ کرد	اساسِ حکم را ممہد کرد

بالکل آخر میں کتاب کے بارے میں لکھا ہے، . . . . بعد حمد و صلواۃ . . . . . "نسخہ غریب تصنیف عالم محقق در جبر الدقق مولوی قبول محمد مرحوم و مغفور مصنف کتاب ہفت قلزم" در شہر لکھنؤ بہ محلہ فراش خانہ، وزیر گنج در مطبع مظہر العجائب باہتمام نحیف و حقیر سید عابد علی بخیر طبع رسید"

مندرجہ بالا مثنوی کا سائز ۸ انچ لمبی اور ۵ انچ چوڑی ہے، تقریباً ہر صفحہ پر ۱۱ اشعار ہیں۔

خواجہ عزیز الدین عزیزؔ لکھنوی پر کام کے دوران یہ کتاب مجیدیہ اسلامیہ انٹر کالج الہ آباد کی لائبریری میں نظر سے گذری اس کا نمبر فن نظم ۱۵۱ ہے۔

تاریخیں قطعات وغیرہ شامل ہیں۔ قابل ذکر ہیں۔ خود خواجہ عزیز نے مثنوی "ید بیضا"
میں اہلی شیرازی کا تذکرہ کیا ہے۔ اور تصنیف کی وجہ یہ لکھی ہے:۔

اہلی من منبعِ فردِ بیاں — بانیِ فن مرجعِ کرد و بیان
جادوئے او جائزِ سحرِ حلال — در کفِ او معجزِ سحرِ حلال
معجزہ خواں گر ہمہ جادو ستاں — طالبِ آں ہر ہمہ جادوستاں
شعر تو آورد خوش اندر دو بحر — منبعِ صد مخزنِ گوہر دو بحر
از یم او تازہ بر آمد دو رود — وز دم او نغمہ در آمد دو رود
قافیہ شد در سرِ تجنیس تنگ — ہم رہِ قید دو در تاسیس تنگ
اہلی ار او اہلِ در ایں کار بود — مشکل یا سہل در انکار بود

اگرچہ مثنوی ید بیضا، اہلی شیرازی کی مثنوی سحر حلال کے جواب میں لکھی گئی
ہے، لیکن سحر حلال سے اپنی لطافت، خوبی اور کشش میں اس سے بہت بڑھ گئی
ہے۔ درحقیقت جو خواجہ صاحب کی قوتِ فکر و سخن آفرینی کی روشن دلیل ہے۔
ید بیضا بھی سحر حلال کی طرح ذوبحرین، ذوقافیتین مع التجنیس ہے[1] بلکہ مثنوی
بقول مصنف:۔

"اکثر ابیاتش سہ سہ چار چار قافیہ دارد و بعضی سراپا مقفی و مسجع ست
و منقوطہ و غیر منقوطہ و فوق النقاط و تحت النقاط و قلب مستوی و حسن تعلیل
و استتباع وغیرہ . . . ."[2]

[1] ایک بحر۔ بحر رمل محذوف یا مقصور ہے۔ فاعلاتن فاعلاتن فاعلن یا فاعلات۔ اور دوسری بحر، بحر
سریع مطوی مکسوف یا موقوف ہے۔ مفتعلن مفتعلن فاعلن یا فاعلات۔ [2] دیوان عزیز الدین صفحہ ۱۵

اب مثنوی کے مختلف حصوں سے کچھ اشعار بطور نمونہ پیش کرتے ہیں۔ ع

اشعار فوق النقاط:۔

در رہ احمد قدم از سر دہش — توشۂ ملک قدم از سر دہش
طاقتِ رفتن نہ و منزل دراز — ہمرہِ من ہمدمِ من دل دراز
غرۂ او غرۂ شہر آمدہ — رونقِ ہر ذرۂ شہر آمدہ
کز در اخلاص ہر آں کو شکست — منزلِ او خاص در آں کو شکست

اشعار غیر منقوطہ:۔

در دل آورد و دل آرام را — داد رہ آورد و دل آرام را
وعدہ او محکم و ہم عہد او — محرم او ہمدم و ہمعہد او
در سر ہر کس سر سودائی او — ہر ہمہ سوداگر سودائے او

خواجہ صاحب کی یہ مثنوی ان کی قادر الکلامی، نکتہ آفرینی اور فن شاعری
میں کامل مہارت کی دلیل ہے۔ پوری غزل تو درکنار ایک آدھ شعر میں کئی کئی
شعری خوبیاں پیدا کرنا اچھے اچھے شعراء کے لیے جوئے شیر لانے سے کم نہیں ہے مگر
خواجہ صاحب نے پوری مثنوی میں بیک وقت دو دو بحریں، کئی کئی قافیے،
حسن تعلیل اور دوسرے محاسن شعری کا استعمال کر کے "نقادِ سخن بیں" استاد
کا لقب حاصل کر لیا ہے۔ تجنیس تام مماثل کی یہ مثال ملاحظہ ہو۔ ع

اے ز تو اندر سر من شورہا — نام تو ہست افسر منشورہا

مندرجہ ذیل شعر میں بیک وقت پانچ پانچ قافیے ہیں اور صنعت عکس
بھی موجود ہے۔ ع

اے نبیِ اُمی ابی اُمی فداک دی ابی اُمی بنی اُمی فداک

اسی طرح پوری مثنوی شعری خوبیوں سے معمور ہے، اب ہم مثنوی "ید بیضا" اور مثنوی "سحر حلال" کے کچھ اشعار ایک دوسرے کے مقابل پیش کرتے ہیں جس سے دونوں کا موازنہ ہو سکے گا۔

	مثنوی ید بیضا	مثنوی سحر حلال	
ابتداء ←	اے نہ تو اندر سرِ من شور رہا	اے ہمہ عالم بر تو بے شکوہ	← ابتداء
″	نام تو ہست افسر منشور رہا	شوکتِ خاک در تو بے شکوہ	″
″	اے قلم از خالِ تو معنا نگار	نامِ تو زان بر سر دیوان بود	″
″	دی رقم (از خالِ) تو رعنا نگار	کاتش بال دپر دیوان بود	″
″	گر سر تحمید تو دارد کتاب	شد تو سر دفتر جان نامزد	″
″	بر در توحید تو آرد کتاب	نام تو خود سکہ بر آں نامزد	″
خطاب ←	اے رخِ زیبائی تو در دلبری	اے کہ بہ اسرارِ تو دانا کمند	← در توحید
″	ذاتت از اندیشۂ باطل بری	کے رسد از عقل کس انجا کمند	″
″	جائی تو اندر دل ما بست و بس	کیست درین مرحلہ تا آخرت	″
″	کلبۂ ما منزل ما ہست و بس	رہرو دل ما شدہ تا آخرت	″
″	عکسِ تو در دیدۂ تر دیدہ است	چوں ہمہ ز اندیشۂ خود دالپسند	″
″	مردمِ جنباں مژہ بر دیدہ است	کے بود اندیشۂ ات از ما پسند	″
درنعت ←	مشعلی از شوز دل آرم بدست	احمد مرسل کہ گل دیں کشت زار	← درنعت
″	رہرو اندر شب تارم بدست	دشمن او در رہ دیں کشت زار	″

	مثنوی ید بیضا	مثنوی سحر حلال	
درنعت ←	طاقت رفتن نہ و منزل دراز	گلبن درین بلبل معنی سرائے	← درنعت
″	ہمرہ من ہمدم من دل دراز	ساختہ در گلشن اعلیٰ سرائے	″
″	ہادی ما ہادی راہ ہدیٰ	گیسوئے او کامدہ دریا کشاں	″
″	حادی ما حادی راہ حدیٰ	مستی او در دلِ دریا کشاں	″
عنوان	ذکر اہلِ شیرازی و سبب تالیف ایں قیل و قال	دربیان الہام ووحی و سبب نظم این کتاب گوید	عنوان
″	ساقی از آن ساغر چینی نژاد	ساقی از اغیار در امشب ببند	″
″	گرچہ دو رنگی دو دو بینی نزاد	رخنۂ آزاد در امشب ببند	″
″	صیقل آں می برداز زنگ ما	امشب ازاں ساغر مے مایہ بخش	″
″	نقش دو رنگ آورد از رنگ ما	کش برد از تو دل بے مایہ بخش	″
″	اہلِ من منبع فردِ بیاں	سرحق از محفل مستاں طلب	″
″	بانیٔ فن مرجع کردِ بیاں	نہ از دل شیخ از دل مستاں طلب	″
″	جادو او جائز و سحر حلال	در محلے کا تش ایمن فروخت	″
″	در کف او معجزہ و سحر و حلال	جان و دل و تن از پے دیدن فروخت	″
″	دیدہ ما نامہ ہم آں آمہ دید	صد محلش پردہ دراں صد محال	″
″	دید ہم آں نام ہم آن نامہ دید	جز مبنی انجا رہ کس خود محال	″
″	معجزہ خواں گر ہمہ جادو ست آں	حق پے آں پردہ دراں رخنہ کرد	″
″	طالب آں ہر ہمہ جادو ستاں	دیدہ الہام در آں رخنہ کرد	″
″	شعر تر آورد خوش اندر دو بحر	دیدہ پیغمبر ازیں دیدہ است	″

بمنبع صد مخزنِ گوہر دو بحر	نہ آئینہ آں آئینہ بیں پیدا ست
انیم او تازہ بر آمد دو رود	گر ز تو الہام بداں جا بنی
وز دم او نغمہ در آمد دو رود	محرم راز است در انجا بنی

مثنوی ہدیۃ الثقلین: اس مثنوی مین خواجہ صاحب نے ایک خواب کا ذکر کیا ہے۔ جس میں وہ ... حضرت رسالت پناہ ؐ کے دیدار سے مشرف ہوئے ہیں۔

جوانی کے زمانے مین ایک بار خواجہ صاحب کے دماغ پر کچھ اثر ہو گیا تھا، اس مبارک خواب کے بعد انھیں فوری صحت ہو گئی۔ تذکرہ شمع انجمن میں اس واقعہ کی طرف اشارہ کیا ہے۔[1]

---

[1] تذکرہ شمع انجمن۔ ص ۳۳۲۔

ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے عہد کے تمدنی جلوے

مرتبہ:- سید صباح الدین عبدالرحمٰن ایم۔ اے

اس میں سلاطین دہلی اور شاہان مغلیہ کے عہد کے دربار، محلات، حرم، لباس، پارچہ بافی، زیورات، جواہرات، سنگار، خوشبویات، خورد و نوش، سازو سامان، تہوار، تقریبات، فنون لطیفہ، مثلاً موسیقی اور مصوری وغیرہ کی پوری تفصیل بیان کی گئی ہے۔

ضخامت :- ۶۵۰ صفحے

قیمت :- ۱۳ــــ۰

ریاض الانشاء
کے قلمی نسخے استانبول میں

از جناب غلام محمد نظام الدین منوبی لکچرار و صدر شعبۂ تاریخ اردو آرٹس کالج (سابق فیلو استانبول یونیورسٹی ترکی) حیدر آباد

دکن کی مشہور و معروف سلطنت، دولت بہمنیہ کے وزیر محمود بن محمد گیلانی المعروف بہ خواجہ جہاں محمود گاواں (۸۱۳ھ تا ۸۸۶ھ)[1] نے جو یادگار تصانیف چھوڑی ہیں ان میں، ریاض الانشاء سب سے زیادہ ممتاز ہے۔ یہ کتاب دراصل محمود کے خانگی خطوط اور سرکاری مراسلہ جات کے مسودوں کا مجموعہ ہے۔ جن کی تعداد تقریباً ڈیڑھ سو کے قریب ہے۔

ان خطوط سے محمود کی خانگی زندگی کے علاوہ بہمنی امراء اور بادشاہوں کے ساتھ اسکے روابط اور پندرہوین صدی عیسوی کے ہندوستان کے سیاسی مسائل پر مستند تاریخی معلومات بھی حاصل ہوتی ہیں۔[2]

فاتح قسطنطنیہ محمد فاتح عثمانی (سلطان ترکی)[3] اوزون حسن (سلطان عراق)[4] حسین بایقرا (پادشاہ خراسان) اور شہنشاہ بابر کے دادا سلطان ابوسعید گورگانی (والئی سمرقند) وغیرہ کے نام جو خطوط لکھے گئے ہیں۔ ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ بہمنی سلطنت پندرہویں صدی کے ہندوستان کی وہ واحد سلطنت تھی جس نے عالم اسلام کے تمام درباروں سے سفارتی تعلقات قائم کئے تھے۔ ایران کے مشہور شاعر اور عالم مولانا عبدالرحمٰن جامی[5] اور ترکی کے عالم مولانا کمال الدین رومی[6] کے ساتھ محمود کے برادرانہ روابط کا پتہ ان ہی خطوط سے

خطوط سے چلتا ہے۔

اس بین ذاتی خطوط کے علاوہ محمود نے سلطان نظام شاہ بہمنی اور سلطان محمد شاہ لشکری بہمنی کی طرف سے بھیجے جانے والے بین المملکتی مکاتیب کے جو مسودے لکھے گئے تھے۔ وہ بھی ریاض الانشاء" میں موجود ہیں۔

ہندوستان میں اس کتاب کے بہ مشکل چند ہی نسخے دستیاب ہوتے ہیں۔ جو بمبئی یونیورسٹی لائبریری۔ بھنڈارکر انسٹیٹیوٹ پونہ اور حبیب گنج لائبریری علی گڈھ میں ہیں۔ ان ہی سے استفادہ کر کے پروفیسر شیخ چاند بن حسین صاحب جو آزادی سے قبل وزارت تعلیم حکومت ہند کے مشیر تھے) نے تصحیح شدہ نسخہ مرتب کیا۔ اور جناب غلام یزدانی صاحب مرحوم ڈائرکٹر ارکیالوجی گورنمنٹ آف حیدرآباد نے اپنی نگرانی میں مجلس مخطوطات فارسیہ حیدرآباد دکن کی طرف سے شائع کیا تھا۔ اس کتاب پر غلام یزدانی صاحب نے ایک معلومات افزا پیش لفظ بھی تحریر کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔

"محمود گاواں کے مکتوبات پر جب مجموعی طور پر نظر ڈالی جاتی ہے تو اس کے اسلوب بیان میں ادبی مٹھاس کی بجائے علمیت زیادہ محسوس ہوتی ہے۔ لیکن اس کی قادر الکلامی میں کوئی شک نہیں۔ اس کی ذہنی قوت سیاسی استعداد۔ اور وسیع علم و دانش ایسے اوصاف تھے۔ جن کی وجہ سے بڑے بڑے بادشاہ اپنے دربار میں محمود کو رکھنا چاہتے تھے۔

آگے چل کر لکھتے ہیں۔ "پروفیسر براؤن مرحوم نے منشآت فریدون بے کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ان مکتوبات سے ہم عصر واقعات پر دلچسپی پڑنے کے علاوہ خود بادشاہوں کے باہمی تعلقات کا حال اچھی طرح معلوم ہو جاتا ہے۔ ریاض الانشاء کی اہمیت بھی بہمنی

سلاطین کے زمانے کے تاریخی واقعات کے لیے ویسی ہی سمجھی جانی چاہئے۔ جیسی کہ فریدون بے کی منشآت کی ترکمانی اور عثمانی خاندان کے بادشاہوں اور حکمرانوں کی تاریخ اور آپس کے تعلقات کے لیے یورپ کے بعض مورخین اور مستشرقین نے تسلیم کی ہے۔"

اسی اہمیت کے پیش نظر یزدانی صاحب نے اس کتاب کو شائع کیا تھا۔ لیکن اس کی تصحیح میں ہندوستان میں پائے جانے والے نسخوں کے علاوہ استانبول یا کسی بیرونی کتب خانے کے نسخے سے مدد نہیں لی گئی، اس مطبوعہ نسخے کے مصحح جناب شیخ چاند صاحب نے جن نسخوں سے استفادہ کیا تھا۔ ان کے بارے میں لکھتے ہیں۔ "سب سے قدیم نسخہ وہ ہے جس کے بارے میں اندازہ کیا گیا ہے۔ کہ وہ سترھویں صدی عیسوی میں نقل کیا گیا ہے حالانکہ استانبول میں ۹۱۰ھ/۱۵۰۴ء اور ۹۱۱ھ/۱۵۰۴ء کے نقل کردہ نسخے موجود ہیں۔ جو ایڈریانوپل اور قسطنطنیہ میں نقل کئے گئے تھے۔

استانبول کے ترک انشاء پردازوں عاکف آفندی۔ آلی آفندی، انسی آفندی اور محمود لامعی وغیرہ کے مجموعات منشآت کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ترکی میں محمود گاواں کا طرز انشاء بہت مقبول ہو گیا تھا۔ اور وہاں ریاض کے بکثرت قلمی نسخوں کا پایا جانا اسکا ثبوت ہے کہ یہ کتاب سولھویں اور سترھویں صدی عیسوی کے مدارس کے نصاب میں داخل ہو گئی تھی۔

محمود گاواں کی مقبولیت اور احترام کا جو جذبہ دولت عثمانیہ میں تھا اس کا اندازہ ان القاب سے لگایا جا سکتا ہے جو اس دور کے عظیم فاتح اور عثمانی خاندان کے آٹھویں بادشاہ سلطان محمد فاتح نے محمود کو خط لکھتے وقت استعمال کئے ہیں۔ مثلاً:

"باسط بساط جود والاحسان۔ امین المملکۃ المحمدیۃ بیمین

السلطنۃ البھمنیہ ۔ مدرس العلماء الاعلام ۔
نظام الاسلام والملک والدولۃ والدین محمود اعلیٰ
شانہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ وغیرہ ۔[59]

محمد فاتح یورپ کا وہ مسلمان بادشاہ تھا جس کی سلطنت کی سرحدیں یوکرین سے لے کر یوگوسلادیہ تک پھیلی ہوئی تھیں[60]۔ اس کا ان القاب کے ساتھ محمود کو مخاطب کرنا اس بات کی شہادت ہے کہ محمود کی علمیت اور قابلیت کا سکہ اس عظیم سلطان پر بیٹھا تھا۔

محمود کے انتقال کے ایک صدی بعد جب ایک ترک عالم علی چلپی نے "روضۃ الانشاء" نامی کتاب فن انشاء کے اصول و قواعد پر لکھی تو اس کے دیباچہ میں لکھتا ہے کہ

"کتاب ہذا کا مولف اس قدر اعلیٰ معیار کا ادیب اور انشاء پرداز نہیں جیسے کہ بدیع الزمان ہمدانی اور خواجہ جہاں محمود گیلانی تھے۔ البتہ ان ہی کے بتائے ہوئے اصولوں کی بنیاد پر ترکی زبان و ادب کے طلبہ کے لیے یہ کتاب لکھی جا رہی ہے"![61]

محمود کے قدر دان کاتبوں نے ریاض الانشاء کے جو نسخے استانبول میں نقل کیے۔ اور جن اعلیٰ القاب کے ساتھ محمود گاواں کا ذکر کیا ہے اس کا بیان آگے آئے گا۔

ہندوستان میں پائے جانے والے تمام نسخوں اور حیدر آباد کے مطبوعہ نسخے میں سلطان ترکی کا نام محمد مراد بک لکھا ہے۔ جو صحیح نہیں ہے۔ استانبول کے نسخوں میں صحیح نام محمد بن مراد ہے، ہندوستانی کاتبوں نے "بن" حذف کر دیا تھا۔ ترکی میں محمد مراد بک کوئی بادشاہ ہی نہیں گزرا۔ رہا سلطان مراد خان تو اس بادشاہ کے دور میں محمود گاواں دکن پہنچا ہی نہ تھا۔ اسی لیے سلطان ترکی کو بہ حیثیت بہمنی وزیر خط لکھنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔[62]

اسی طرح عثمانی وزیر کے موسومہ خط میں محمود شاہ لکھ گیا ہے، یہ بھی حیدر آباد کے مطبوعہ

نسخہ کی غلطی ہے۔ عثمانی وزیر کا نام صحیح محمود پاشا ہے جو استانبول کے نسخوں میں درج ہے محمود پاشا سلطان محمد فاتح کے دور میں وزیر تھا، اور صربستان یعنی موجودہ یوگوسلاویہ کا رہنے والا تھا، اور اسکو بھی اسکے بادشاہ نے اسیطرح قتل کرایا تھا جس طرح محمود گاواں کو محمد شاہ لشکری نے قتل کرایا تھا۔[63]

ذیل میں شہر استانبول میں پائے جانے والے مشہور کتب خانوں کے نسخوں کی کیفیت درج کی جاتی ہے۔

(۱) نسخۂ عاشر آفندی کتب خانے سی۔ نومرو ۔ ۸۱۱

۲۶×۱۷ سم سائز کا یہ نسخہ جلی۔ خوشخط۔ نستعلیق میں بمقام قسطنطنیہ (استانبول) ۹۱۱ھ بعہد سلطان بایزید خان عثمانی دوم نقل ہوا ہے۔ اس طرح مصنّف کی وفات کے صرف پچیس[25] سال بعد کا نسخہ ہے۔ کاتب محمد بن بصیری کو خواجہ جہاں محمود گاواں سے خاص تعلق تھا۔ اس نے محمود کی تصانیف ریاض الانشاء اور مناظر الانشاء کے کئی نسخے نقل کیے ہیں۔ نسخۂ ہذا میں یہ ترجمہ درج ہے۔

"تمت بعون اللہ وحسن توفیقہ فی نصف شہر رمضان المبارک علی ید اضعف عباد اللہ واحوجھم محمد بن احمد بصیری جعل اللہ الی عین العیان مطلعا وبصیرا اسند معینا ونصیرا فی تاریخ سنہ احدی عشر وتسعمایہ ببلد قسطنطنیہ"

ابتدائی صفحے پر کتاب کا نام "منشات خواجہ جہاں" لکھا گیا ہے۔

(۲) نسخۂ ایا صوفیہ کتب خانے سی ۔ نومرو ۴۳۱۳

اس نسخہ پر بھی کاتب نے "منشآت خواجہ جہاں" کی سرخی درج کی ہے۔ کتابت

صاف خوش خط نستعلیق ہے۔ اور خط کی مماثلت بتلاتی ہے کہ اس کی کتابت بھی کاتب بصیری نے کی ہوگی۔ لیکن نسخہ کے کسی حصہ میں کاتب کا نام، سنہ کتابت اور مقام کتابت درج نہیں ہے۔ چونکہ یہ نسخہ سلطان محمود خاں عثمانی (سنہ ۱۷۳۰ تا سنہ ۱۷۵۴) کے کتب خانہ میں محفوظ تھا۔ اسی لیے شاہی مہر کے علاوہ ایک اور مہر بھی ابتدائی صفحہ پر ثبت ہے۔ اس نسخہ کے خطوط کی تعداد بھی اوپر کے نسخہ سے زیادہ ہے۔ کتاب کا اختتام محمود کے اُس قصیدہ میں کیا گیا ہے۔ جو ہمایوں شاہ بہمنی (سنہ ۱۴۵۸ تا سنہ ۱۴۶۱) کی تعریف میں ہے۔ اس کا سائز ۱۰ × ۷" انچ اور اوراق ۲۱۴ ہیں۔ کتاب کے متن میں جہاں دوسرے نسخوں میں ریاض الانشاء لکھا ہے۔ اس نسخہ میں ریاضیہ الانشاء ہے۔

(۳) نسخہ دیگر ایاصوفیہ۔ نومرد ۴۳۱۵

۶ × ۵ انچ سائز کا یہ چھوٹا سا نسخہ ۲۵۸ اوراق پر مشتمل خط نستعلیق میں ہے۔ لیکن اس کا خط اور کاغذ دونوں ٹھیک نہیں۔ اس میں بھی اختتامی صفحات پر ہمایوں شاہ بہمنی کا مدحیہ قصیدہ اور متن میں کتاب کا نام "ریاضیہ الانشاء" تحریر ہے۔ البتہ ابتدائی صفحے پر "منشآت خواجہ جہاں" کی سرخی ہے۔ کتاب کا نام مقام کتابت اور سنہ کتابت درج نہیں۔

(۴) نسخہ بغدادلی وہبی آفندی کتب خانے سی۔ نومرد ۱۲۴۷

یہ نسخہ کسی قدر خستہ حالت میں ہے۔ کاغذ اور کتابت بھی بہتر نہیں۔ خط نستعلیق ہے۔ مقام کتابت نامعلوم۔ سنہ کتابت سنہ ۹۵۱ھ۔ سائز ۸ × ۶" انچ۔ تعداد اوراق ایک سو چالیس۔ کتاب کے آخر میں کاتب نے خاتمہ عبارت یوں درج کی ہے:

تمت الرسالة الشریفة المسماة بریاض الانشاء من مصنفات

الحضرت المولا المحقق والجبر المدقق المنتشر آثار فضله فی الآفاق المستجمع الاصناف فنون الانشاء والابداع علی الاطلاق الذی یستفیض بن رجق زلال افضاله علی قدر حاله کل من له قابلیت واستحقاق المولانا کمال الدین محمود الکیلانی المشتهر بخواجهٔ جهان نور الله مرقده وعطر مشهده علی یدا افقر الفقراء واحقر العباد العبد الضعیف المتحرق الفواد الکثیر النسیان القلیل السن ادد ر ویش محمد البدلیسی الروشکی غفر الله وله ولوالدیه فی یوم یقر المرا اخیه وامه وابیه فی شهر رجب المرجب من مشهور سنه احدی وخمسین وتسعماید الهجریه النبویه۔

اس عبارت سے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ کتابت کس شہر میں کی گئی، البتہ کاتب کے نام کے ساتھ البدلیسی سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ مشرقی اناطولیہ کے شہر بدلیس کے رہنے والے تھے ممکن ہے کہ کتابت بھی علاقہ اناطولیہ کے کسی شہر میں کی گئی ہو۔ اس نسخہ کے ابتدائی صفحات پر ریاض الانشاء یا منشآت خواجہ جہاں کی قسم سے کوئی سرخی درج نہیں ہے۔ البتہ اختتام ہمایوں شاہ بہمنی کے مدحیہ قصیدہ پر ہے۔ یہ نسخہ کسی قدر آب زدہ ہے، جس سے بعض مقامات پر الفاظ مٹ گئے ہیں پھر بھی کتاب خانہ کے انتظامیہ نے جدید جلد بندی کر کے اس کو محفوظ کر دیا ہے۔ یہ نسخہ کسی طالب علم کے استعمال میں رہا ہے۔ کیونکہ جگہ جگہ سرخ روشنائی سے الفاظ کے معنی۔ ہدایات اور اشارات درج ہیں۔ مثلاً ایک جگہ ہے:

منشآت جامی جواب نامہ ملک التجار "معلوم نہیں کاتب محمود بدلیسی کو محمود گاواں

کا نام کمال الدین کیسے معلوم ہوا حالانکہ وہ دکن میں عماد الدین کے لقب سے موسوم ہے۔

(۵) نسخۂ فاتح جامع کتب خانے سی۔ نومرد۔ ۱۲۲۴

ریاض الانشاء اور مناظر الانشا کا یہ نسخہ تقریباً ساڑھے تین سو اوراق پر مشتمل ہے کتب خانہ کی طرف سے اس کی جو نشان اندازی کی گئی ہے وہ غلط ہے۔ ریاض کا متن ۲۴۰ اوراق پر مشتمل ہے۔ اعلیٰ درجہ کے چمک دار کاغذ پر خط نستعلیق میں انتہائی دیدہ زیب کتابت ہے۔ ریاض کے متن کے اختتام پر ہمایوں شاہ کا مدحیہ قصیدہ ہے۔ اس کے بعد بہمنی سلطان کا ایک خط سلطان بایزید دوم عثمانی کے نام درج ہے۔ جس کا مسودہ محمود گاواں کے بجائے کسی اور منشی نے لکھا ہے۔ مکتوب کی سرخی یہ ہے۔ "صورت مکتوب ارسل لعبدہ السلطان الہندالی سلطان الروم بایزید خان خلد ملکہ" خط کے متن کے اختتام پر تاریخ ذیقعدہ ۸۶۶ھ درج ہے جبکہ محمود گاواں کے کسی خط پر تاریخ کا سرے سے درج نہیں۔

تاریخ بالا کے لحاظ سے یہ خط محمد شاہ لشکری بہمنی کا لکھا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ خط میں حسب ذیل الفاظ میں محمود گاواں کے قتل کے اسباب بیان کئے گئے ہیں۔

"دریں وقت بسبب آنکہ از صاحب خبران وثیق و معتمدان صاحب مرصد نقش سخنے چند کہ مبنی از فساد و تغیر خلوص فواد او بود بسمع این صفا فواد رسید و از افعال و اعمالش صورتی چند مشاہدہ نمود مناسب رتبت او نبود و مستلزم خلاف و عناد می نمود بنا و بریں بر حسب مقتضی الناس مجزیون باعمالھم بعالم جزا و اصل شدہ"[۵۲]

[۲۴] یہ چار سطریں ہندستان کی تاریخ کا اہم ماخذ ہیں کیونکہ کسی تاریخ میں بھی محمود گاواں کے قتل کے اسباب خود بادشاہ بہمنی کی زبان سے منقول نہیں۔ اس خط کو استانبول لے جانے کے لئے شاہ نعمۃ اللہ کو سفیر بنا کر بھیجا گیا تھا۔ جو اس سے قبل محمود گاواں کی طرف سے بادشاہ گیلانی کے دربار میں سفیر کی خدمت پر فائز تھے۔[۲۳]

مناظرات انشاء کے متن کے خاتمہ پر کاتب نے سنہ کتابت یوں درج کیا ہے:

"فرغ من سویدہ فی یوم الاثنین من اوائل شہر رجب ۹۱۵ھ"

اسطرح یہ نسخہ محمود کی وفات کے صرف انتیس سال بعد سلطان بایزید دوم کے دور حکومت میں دولت عثمانیہ میں نقل ہوا ہے۔ ممکن ہے۔ خود سلطان کے حکم سے نقل ہوا ہو۔ کیونکہ وہ اعلیٰ کاغذ اور نفیس کتابت کے لحاظ سے ان کتابوں کا ہم پلہ ہے جو خاص شاہی کتب خانہ میں محفوظ ہیں۔ افسوس کہ کاتب نے اپنا نام۔ اور مقام کتابت درج نہیں کیا۔ نسخہ کا سائز ۲۴ × ۱۵ سمر ہے۔ متن کی اندرونی سرخیاں سرخ روشنائی سے لکھی گئی ہیں۔ کتاب قدیم چرمی جلد اور زرین نقوش سے آراستہ ہے۔

(۶) نسخۂ دیگر فاتح جامع۔ نومرد ۴۱۲۳

۲۲ ½ × ۱۳ ½ سمر کا یہ نسخہ ۱۸۰ اوراق پر مشتمل اور نہایت خوشخط اور بہت باریک قلم سے خط نستعلیق میں تحریر ہے۔ کتاب کا عنوان "منشآت خواجہ جہاں" صفحہ اول پر درج ہے۔ اور متن کے اختتام پر حمایوں شاہ بہمنی کا مدحیہ قصیدہ۔ خطوط کے عنوانات وغیرہ سرخ روشنائی سے تحریر ہیں۔ افسوس ہے کہ اس نسخہ کے کاتب نے بھی اپنا نام۔ سنہ کتابت اور مقام کتابت درج نہیں کیا ہے۔ اندازاً ۹۱۰ھ تا ۹۲۰ھ کی درمیانی مدت میں لکھا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ اوپر کے نسخہ سے مماثلت پائی جاتی ہے۔

(۷) نسخۂ دیگر فاتح جامع ۳۹۱۱

"۵ × ۶" سائز کا یہ چھوٹا سا نسخہ عثمانی خط دیوانی میں تحریر ہے۔ ابتدائی صفحہ پر آب زر سے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم اور صفحہ ۲ پر کتاب کا نام سرخ روشنائی سے "ریاض الانشاء" لکھا گیا ہے۔ متن کے آخر میں ہمایوں شاہ بہمنی کا مدحیہ قصیدہ بھی درج ہے۔

کاتب مصطفےٰ بن یعقوب المنخالجی نے اسکی کتابت ۹۱۰ھ میں محمود گاواں کی وفات سے چوبیس سال بعد کی ہے۔ افسوس ہے کہ مقام کتابت کا کہیں ذکر نہیں۔ کتابت کے لئے بہت باریک قلم استعمال کیا گیا ہے۔ جملہ اوراق ۱۰۴ ہیں۔ اختتامی عبارت یوں تحریر ہے۔

"کتبہ عبد ضعیف نحیف مذنب محتاج الی رحمۃ ربہ
مصطفےٰ ابن یعقوب بن ذکریا المنخالجی احسن اللہ الیہم
فی اوسط جمادی الاول تاریخ النبویۃ الہجریۃ الہلالیہ
سنۃ عشر وتسعمائۃ تم"

(۸) نسخہ حامد آفندی کتب خانہ سی۔ نومرو ۲۹۲

۹۲۲ھ اسلامی تاریخ کا وہ اہم سال ہے۔ جب عثمانی سلطان سلیم اول نے حجاز، شام اور مصر فتح کئے تھے۔ اسی سال یہ نسخہ مشہور کاتب محمد بن احمد بصیری نے قسطنطنیہ میں مکمل کیا۔ ریاض کے متن کے ساتھ کاتب نے اپنا مختصر سا مجموعۂ کلام بھی منسلک کیا ہے۔ ۱۷ × ۲۶½ سم کے اس نسخے میں جملہ ۲۹۰ اوراق ہیں۔ اور ریاض کا متن ۲۲۰ اوراق پر مشتمل ہے۔ باقی پر بصیری کا کلام درج ہے۔ جس میں بیشتر وہ فارسی اور ترکی قصائد ہیں۔ جو سلطان بایزید دوم

۱۴۸۱ء تا ۱۵۱۲ء اور سلطان سلیم ۱۵۱۲ء تا ۱۵۲۰ء کی مدح میں لکھے گئے ہیں۔ ریاض کے متن کے اختتام پر دیگر نسخوں کی طرح اس میں بھی ہمایوں شاہ بہمنی کا قصیدہ ہے۔ جس کے نیچے حسب ذیل عبارت تحریر ہے۔

تمت الرسالۃ الموسومۃ بریاض الانشاء علی ید العبد
الفقیر الی اللہ محمد بن احمد الشہیر بصیری نور اللہ بصیرتہ
بنور الایقان بمحمد بن عدنان فی ثامن عشر رجب
سنہ ثلثۃ وعشرین وتسعمایہ ببلدۃ قسطنطنیۃ حمیت
عن البلیۃ وسلم تسلیماً کثیراً کثیراً"۔

ابتدائی صفحے پر ایک طرف باریک قلم سے کتاب کا عنوان یوں درج ہے:

"منشآت محمد گیلانی و دیوان بصیری بخط" اور صفحہ ۲ پر جلی خط میں "ریاض الانشاء بخواجہ جہاں" تحریر ہے۔ عمومی حیثیت سے یہ نسخہ واضح اور خوشخط ہے۔ البتہ کاغذ اچھا نہیں۔

نسخۂ ہذا کسی زمانے میں مکہ معظمہ کے مفتی مولانا قطب الدین کی ملکیت رہا ہے۔ انھوں نے صفحہ ۳ پر اپنے ہاتھ سے حسب ذیل عبارت لکھی ہے۔

"مولانا محمود بن شیخ محمد گاوان المخاطب بخواجہ جہاں صاحب الانشاء،
توفی شہیداً سعیداً فی ۸۸۶ھ و تاریخ شہادت مرحوم خرابی دکن
است۔ فی الواقع بعد از مرحوم دکن خراب است۔ نقلتہ من خط المولی المفتی
بمکۃ المشرفۃ"۔

افسوس ہے، کہ مفتی صاحب نے اس عبارت میں تاریخ درج نہیں کی جس سے

اندازہ ہو سکتا کہ یہ نسخہ کس سنہ میں مکہ معظمہ میں تھا۔ انھوں نے محمود گاواں کی تاریخ و سنہ شہادت دونوں غلط درج کئے ہیں۔ محمود کی شہادت ۵ صفر ۸۸۶ھ[۶] کو واقع ہوئی۔ اور یکم صفر ۸۸۸ھ کو محمد شاہ لشکری بہمنی کا انتقال ہوا۔ دکنی مورخین کے بیان[۷] اور خرابیٔ دکن کے اعداد دونوں لحاظ سے یہ محمد شاہ لشکری بہمنی کی تاریخ وفات ہے، نہ کہ محمود گاواں کی۔

ریاض الانشاء کے نسخے استانبول میں جس نفاست اور خوبصورتی سے نقل ہوئے اور محفوظ کئے گئے ہیں۔ ان سے دولت عثمانیہ میں محمود گاواں کی غیر معمولی مقبولیت اور اس کے طرز انشاء کی عظمت کا اظہار ہوتا ہے۔

حوالہ جات

۱۔ شیخ چاند بن حسین۔ ریاض الانشاء۔ مطبوعہ گورنمنٹ پریس حیدرآباد دکن ۱۹۴۷ء دیباچہ ص ۲

۲۔ ریاض کے مطبوعہ نسخہ میں سلاطین گجرات کے نام (۹) خط۔ سلاطین جونپور کے نام (۱) اور سلاطین مالوہ کے نام (۲) خط درج ہیں۔

۳۔ ریاض کے مطبوعہ نسخہ میں عثمانی سلطان کے نام چار خط ہیں، جن میں ایک محمد شاہ لشکری بہمنی کی طرف سے اور تین خود خواجہ جہاں محمود گاواں کی طرف سے بھیجے گئے تھے۔ استانبول کے قلمی نسخوں کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مطبوعہ نسخہ کا خط ۵۶ غلط طور پر سلطان روم (ترکی) کے نام چھپ گیا ہے اور مصحح کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ حقیقت میں وہ سلطان عراق اوزون حسن کا موسومہ ہے۔

۴۔ سلطان عراق کا نام حیدرآباد کے مطبوعہ نسخہ میں کہیں حسینی بیگ اور کہیں حسین بیگ لکھا گیا ہے۔ صحیح نام حسن بیگ ہے۔ یہ بات بھی استانبول کے قلمی نسخوں سے واضح ہوتی ہے۔ نیز مصحح نے جن نسخوں سے استفادہ کیا ہے۔ ان میں سے بھی ایک نسخہ میں صحیح نام موجود ہے۔ اس وقت کے سلطان عراق کا نام حسن بیگ بن علی بیگ بن قرا عثمان تھا۔ جو آق قویونلو خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ چونکہ اس بادشاہ کا قد بہت اونچا تھا۔ اسی لئے "اوزون حسن" یعنی "لانبے حسن" کی عرفیت سے مشہور ہو گئے۔ فارسی اور ترکی تواریخ کے علاوہ انگریزی تواریخ میں بھی اسی نام سے یاد کئے جاتے ہیں۔ (دیکھئے۔ انسائیکلوپیڈیا آف اسلام مطبوعہ لندن ۱۹۳۴ء جلد ۴ صفحہ ۱۰۶۵)

۵۔ ریاض الانشاء (مطبوعہ نسخہ حیدرآباد) صفحات ۱۹، ۱۵۲، ۱۲۷، ۲۰۷ وغیرہ،

۶۔ ایضاً ایضاً صفحات ۱۶۳ تا ۱۶۵

۷۔ اس مجلس کے صدر موجودہ ریاست مہاراشٹر کے گورنر نواب علی یاور جنگ بہادر اور ارکان میں پروفیسر ہارون خان شیروانی شامل تھے۔

۸۔ ریاض الانشاء	مطبوعہ نسخہ حیدرآباد	صفحات ی ۱ ی ب	
۹۔ ایضاً	ایضاً	صفحہ ف ۸	
۱۰۔ ایضاً	ایضاً	صفحہ ف ز	
۱۱۔ عاکف آفندی۔	منشآت عاکف۔	قلمی نسخہ کتب خانہ اسعد آفندی استانبول	
۱۲۔ آلی آفندی۔	منشآت آلی۔	ایضاً	ایضاً
۱۳۔ انسی آفندی۔	منشآت انسی	ایضاً	ایضاً
۱۴۔ محمود لامعی۔	منشآت لامعی	ایضاً	ایضاً
۱۵۔ عبداللہ آفندی۔	منشآت فارسی	قلمی نسخہ کتب خانہ اسعد آفندی استانبول	

(سلطان محمد عثمانی کا یہ خط رجب ۸۸۵ھ میں لکھا گیا تھا جس کا فوٹو راقم کے پاس محفوظ ہے)

۱۶ کلثوم ارغون رنک لی تاریخ (بزبان ترکی جدید) مطبوعہ استانبول جلد ۵ ص ۳۶

۱۷ علی چلپی۔ روضۃ الانشاء (بزبان ترکی قدیم) قلمی نسخہ کتب خانہ اسعد آفندی استانبول

۱۸ سلطان مراد کی وفات ۱۴۵۱ء (دیکھئے۔ دلافرون کیئر۔ مترجم ہاشمی فرید آبادی
تاریخ دولت عثمانیہ۔ مطبوعہ دار الترجمہ جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن ۱۹۳۹ء جلد ۱ ص ۱۳۲
محمود گاواں کا وزارت بہمنیہ پر فائز ہونا ۱۴۶۹ء (دیکھئے۔ انسائیکلوپیڈیا آف اسلام
جلد ۳ صفحہ ۱۳۵)

۱۹ ریاض الانشاء (مطبوعہ) صفحہ ۱۲۵۔ محمود پاشاہ صربستانی کے تفصیلی حالات
کے لئے دیکھئے انسائیکلوپیڈیا آف اسلام جلد ۳ صفحہ ۱۳۶

۲۰ دلافرون کیئر (اردو ترجمہ) جلد ۱ صفحہ ۹۶

۲۱ بصیری۔ ہرات کے رہنے والے تھے۔ ابتداً والی خراسان سلطان حسین
بایقرا کے ملازم ہوئے سلطان کی وفات کے بعد مولانا جامی کے سفارشی خط کے ساتھ
سلطان بایزید دوم عثمانی کے دربار میں قسطنطنیہ آئے۔ سلاطینِ عثمانی نے کافی
قدر و منزلت کی۔ قانونی سلطان سلیمان ذی شان کے ساتھ جزیرہ رہوڈس کی
مہم میں شریک تھے۔ ۹۴۱ھ میں بمقام استانبول انتقال کیا۔ ان کے تفصیلی حالات
اور کلام کے لیے دیکھئے۔ عاشق چلپی۔ مشاعر الشعراء (بزبان ترکی قدیم) مطبوعہ
گب میموریل سیریز۔ لندن ۱۹۷۱ء صفحہ ۵۵۸

۲۱/۱ بدلیس اور روس چکی یا ردشگی کے لیے دیکھئے۔ انسائیکلوپیڈیا آف اسلام
جلد ۲ صفحہ ۱۱۴۴

۲۲ اس خط کا فوٹو بھی راقم کے پاس محفوظ ہے۔ علاوہ ازیں فریدون بے نے
منشآت السلاطین جلد ۱ صفحہ ۲۵۲ پر نقل کیا ہے۔ دیکھئے مطبوعہ نسخہ قسطنطنیہ ۱۲۷۴ھ

۲۳ ریاض الانشاء (مطبوعہ) صفحات ۳۲۰، ۳۲۳، ۳۲۷، ۳۳۱

۲۴ قطب الدین ملی النہروالی۔ البرق الیمانی فی الفتح العثمانی۔ ریاض (سعودی
عربیہ) ۱۹۶۷ء صفحہ ۲۴

۲۵ فرشتہ۔ اردو ترجمہ۔ فدا علی طالب۔ مطبوعہ دار الترجمہ جامعہ عثمانیہ
حیدرآباد دکن۔ جلد ۳ صفحہ ۲۰۳

۲۶ ایضاً ایضاً جلد ۳ صفحہ ۲۰۰

۲۷ فرشتہ اردو ترجمہ نولکشور لکھنؤ جلد ۱ صفحہ ۴۶۸

ادبیات

سرودِ باتف

از۔ جناب رئیس نعمانی

شکست شوق فسانہ ہے قُم بِاِسمِ اللہ
یہ خود فریب زمانہ ہے قُم باسم اللہ

نہ وہ نگاہ دلوں میں جو بجلیاں بھر دے
نہ وہ شرابِ شبانہ ہے قُم باسم اللہ

امید یاس کے دامن میں ڈھونڈتی ہے پناہ
اداس، اداس زمانہ ہے قُم باسم اللہ

لٹا نہ دولت ایماں کہ رند و زاہد کی
سرشت مشترکانہ ہے قُم باسم اللہ

نہ دیر و گلشن و ویرانہ ہے تری منزل
حرم نہ تیرا ٹھکانہ ہے قُم باسم اللہ

نزاعِ سبحہ و زنار، و عشق و بے بصری
یہ قضیہ کتنا پرانا ہے قُم باسم اللہ

نوائے شعلہ فشاں اسرو ہے حریم حیات
خموشیوں کا زمانہ ہے قُم باسم اللہ

نہ چل سکے گا فسوں اس پہ دیر و کعبہ کا
کہ دل خدا کا ٹھکانہ ہے قُم باسم اللہ

رہے گا تابقیامت "ظہور جاؤ الحق"
ہو منقلب جو زمانہ ہے قُم باسم اللہ

زباں سے کہدیا "سُبحَانَہ" تو کیا حاصل
دلوں میں اس کو بسانا ہے قُم باسم اللہ

تہی ہے دامنِ اسباب تو نہ ہو مایوس
میری نظر میں زمانہ ہے قُم باسم اللہ

مطیع عزم و عمل ہے نظامِ کون و مکاں
یہاں نہ چاہے بہانہ ہے قُم باسم اللہ

بیاضِ صبح بھی ہے ہر شب سیاہ کے بعد
یہی نظام زمانہ ہے قُم باسم اللہ

رئیسؔ مرگ جمد سے کہاں عبارت ہوت
یہ دل سے سوز کا جانا ہے قُم باسم اللہ

نعت

از۔ جناب قمر سنبھلی

فیض اُن کے آستانِ پاک سے پانے چلے
ہر قدم کہتے ہوئے لبیک دیوانے چلے

سوئے طیبہ آنسوؤں کے لیکے نذرانے چلے
کاروان در کاروان آج انکے دیوانے چلے

سوزِ دل کا اقتضاء شمعِ نبوت کی کشش
جانبِ ارضِ حرم کھنچ کھنچ کے پروانے چلے

اُن کی خوش بختی پہ کیوں کونین کو آئے نہ رشک
جو شہ بطحیٰ کے دامن میں سکون پانے چلے

جوت لیکر آستاں کی خاک سے اہلِ نظر
دل کے زنگ آلود آئینوں کو چمکانے چلے

ان سے پہلے کسقدر بیرنگ تھے اوراقِ زیست
ان کے آنے سے جہاں میں حق کے افسانے چلے

اے قمر بن کر نقیبِ عظمتِ انساں حضورؐ
جلوہ گاہِ قدس کے پردوں کو سرکانے چلے

نعت

از۔ جناب مولوی عثمان احمد صاحب

الٰہی کاش مدینے کا پھر سفر ہوتا
دیارِ رحمتِ عالم میں پھر گذر ہوتا

وہی مدینے کے لیل و نہار پھر ہوتے
وہ شام ہوتی وہی جلوۂ سحر ہوتا

اُدھر سحر ہوتی عنایت کی بارشِ پیہم
جو دامن اشکِ ندامت سے تر بتر ہوتا

بہاتے اشکِ ندامت پکڑ کے جالی کو
ہر ایک قطرہ مرے اشک کا گہر ہوتا

وہ کوچے ملتے جہاں پر چلے ہیں شاہ امم
انہی کا نقشِ قدم اپنا راہبر ہوتا

سمجھتا میں کہ مجھے مل گئی حیاتِ ابد
فدا حضورؐ پہ جو دم دل و جگر ہوتا

جو دیکھتے کہیں اڑتا غبار طیبہ میں
ہمارے واسطے وہ سرمۂ نظر ہوتا

پہنچ کے کاش مدینے میں بینوا عثماں
نگاہِ لطف و عنایت سے بہرہ ور ہوتا

قطعہ تبریک حج

قطعہ تبریک بر شرف زیارت حرمین شریفین خدمت شفیق مکرم جناب شاہ معین الدین احمد صاحب ندوی، مدیر معارف

از۔ ارادت کیش پروفیسر نگہت شاہجہاںپوری،

راقم کے دیرینہ کرم فرما جناب نگہت شاہجہانپوری نے از راہ لطف یہ قطعات مرحمت فرمائے ہیں، اپنی نسبت سے کچھ شایع کرنا اچھا نہیں معلوم ہوتا محض ان کے اخلاص کی یادگار میں شائع کیا جاتا ہے:

"م"

......٥٥٠٥......

چاہیے مجھکو نہ تسبیح نہ مصلّٰی نہ کھجور
یاد ہی آپ کی ہے میرے لیے جانِ سرور!

حسرتِ بوسہ یہ پیغام "میں بھی لذت ہو
یہی کیا کم ہے نہیں آپکے دل سے میں دور!

جب کہ ایماں ہی "بالغیب" ہو مقصودِ شہود
میرا سینہ بھی نہ ہو کیوں ہمہ تن جلوۂ طور!

......٥٥٠٥......

"حرم قدس" کے نظارۂ دلکش ہے ہے!
چشم پُر جلوہ جھکے کیوں طرفِ حور و قصور!

دل نگہت کو بھی ارمانِ قدمبوسی ہے،
کاش پوری ہو کسی طرح تمنائے حضور!

وحشن اللہ! نظرِ لطفِ نبیؐ اکرم
بارک اللہ! شرفِ کعبہ و حجِ مبرور

......٥٥٠٥......

مطبوعات جدیدہ

انتخاب الترغیب و الترہیب، مترجمہ۔ مولوی محمد عبد اللہ صاحب دہلوی، لمبی تقطیع کاغذ کتابت وطباعت اچھی صفحات ۳۲۰ مجلد مع گرد پوش، قیمت عہ غیر مجلد عہ مرتبہ:۔ ندوۃ المصنفین اردو بازار جامع مسجد دہلی

ترغیب و ترہیب کی حدیثوں کے جو مجموعے مرتب کیے گئے ہیں، ان میں امام زکی الدین ابن عبد العظیم منذری کی کتاب الترغیب والترہیب بڑی جامع اور بعض حیثیتوں سے زیادہ اہم ہے، اس میں اعمال صالحہ کے اجر و ثواب اور اعمال سیئہ پر زجر و عقاب کے متعلق مختلف کتب حدیث کی روایتوں کو جمع کیا گیا ہے، گو فضائل کی روایات میں محدثین نے احکام وغیرہ کی طرح زیادہ شدت سے کام نہیں لیا ہے، اس لئے فضائل کے مجموعے صحیح و ضعیف ہر طرح کی روایتوں پر مشتمل ہوتے ہیں، مگر امام منذری نے ان میں امتیاز کے لئے بعض اشارات اور علامتیں مقرر کر دی ہیں، جن سے حدیث کی حیثیت کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ ان کے مجموعہ کی اہمیت اور خصوصیات کی بنا پر ہر زمانہ کے اہل فن نے اس کے ساتھ اعتناء کیا ہے۔ اب مولوی محمد عبد اللہ صاحب دہلوی نے بھی اس مفید اور اہم کتاب کا انتخاب شائع کیا ہے، اس میں حدیثوں کا اصل متن، ترجمہ اور ان کی تشریحات شامل ہیں، شروع میں فاضل مترجم کے قلم سے تقریباً ڈھائی سو صفحے کا ایک مبسوط مقدمہ ہے، جس میں ترغیب و ترہیب کی کتابوں کی فہرست، امام منذری

کا تذکرہ، زیر نظر مجموعہ کی خصوصیات، اس کی تلخیصوں، ضمیموں، شرحوں، حاشیوں اور اردو اور بعض دوسری زبانوں کے ترجموں کا ذکر کیا گیا ہے۔ اور فن حدیث کی بعض اصطلاحات اس کی حجیت اہمیت اور دینی حیثیت، جمع و تدوین حدیث کی مختصر تاریخ اور کبار محدثین کے حالات زندگی تحریر کئے ہیں، اس ضمن میں منکرین حدیث کے شبہات کا جواب اور ترغیب و ترہیب کی حدیثوں میں محدثین کی نرمی کے اسباب بھی معرض تحریر میں آگئے ہیں اس حیثیت سے یہ مقدمہ ایک مستقل تصنیف کی حیثیت رکھتا ہے۔ ترجمہ و تشریح کی زبان آسان ہے اس لئے طلبۂ حدیث کے علاوہ عام مسلمانوں کیلئے بھی یہ مجموعہ مفید ہے۔

تذکرہ شیخ الاسلام محمد بن عبدالوہاب مترجمہ۔ مولوی صفی الرحمٰن صاحب اعظمی تقطیع خورد، کاغذ کتابت و طباعت اچھی صفحات ۱۳۰ قیمت ۱۵ پیسے پتہ (۱) مدرسہ عربیہ دار التعلیم محلہ پورہ صوفی۔ پوسٹ مبارکپور، اعظم گڈھ۔ یو۔ پی (۲) ادارۂ اشاعت دینیات ۱۲۱

مشہور مصلح شیخ الاسلام محمد بن عبدالوہاب نجدی کے متعلق اردو میں غالباً سب سے پہلے مولانا اسلم جیراجپوری اور دار العلوم ندوہ کے لائق فرزند مولانا مسعود عالم ندوی مرحوم نے مستقل کتاب لکھی اور ان کے اصلاحی و دعوتی کارناموں کو دکھایا۔ اور ان پر بے سروپا الزامات کا جواب دیا، زیر نظر کتاب بھی جو قاضی قطر احمد بن حجر کی عربی تصنیف ہے اسی مقصد سے لکھی گئی ہے، اور مولوی صفی الرحمٰن اعظمی نے اس کا سلیس اور رواں اردو ترجمہ کیا ہے شروع میں مترجم کے قلم سے ایک مبسوط مفید مقدمہ بھی ہے، اس میں آل سعود کی مختصر تاریخ اور مختلف سعودی حکمرانوں کے دور کے علمی، مذہبی اور سیاسی حالات اور ان پر شیخ کی دعوت کے اثرات وغیرہ دکھائے ہیں، جو امیر محمد بن سعود کے دور سے شروع ہو کر

موجودہ حکمراں شاہ فیصل کے عہد پر ختم ہوتا ہے۔ اس لحاظ سے یہ مقدمہ گویا آل سعود کی گذشتہ ڈھائی سو سالہ دور حکومت کی مختصر سرگذشت ہے، اصل کتاب میں شیخ کے حالات و سوانح، عقائد و خیالات، اصلاحی و دعوتی کارنامے ان کی دعوت کے اصول اور نجد و بیرون نجد میں اس کے اثرات بیان کئے گئے ہیں، ایک باب میں ان پر لگائے جانے والے الزامات کی مفصل تردید کی گئی ہے، اور آخر میں عالم اسلام کے متعدد مشاہیر اور بعض مستشرقین کے اقوال اور شہادتوں سے ان کی علمی و دینی عظمت ثابت کی گئی ہے۔ مترجم نے بعض مختصر توضیحی حاشیے بھی لکھے ہیں، لیکن متن اور حواشی دونوں میں کہیں کہیں شدت آگئی ہے، اسی چیز نے شیخ جیسے مصلح کی شخصیت کو متنازع بنا دیا ہے اس لئے ان کے سوانح نگاروں اور معتقدین کو اس سے احتراز کرنا چاہئے۔

تاثرات - مرتبہ الحاج حکیم ابو الحسنات ایوب حسن صاحب بیدل فاروقی متوسط تقطیع کاغذ کتابت و طباعت اچھی صفحات ۲۲۴ قیمت ۶ عہ پتہ حکیم ابو الحسنات ایوب حسن بیدل، صدر شعبہ عربی فارسی، اردو گورنمنٹ ٹریننگ کالج میسور،

اس میں اردو اور ہندی ادب و تمدن پر عربی و فارسی کے کلچرل اور ادبی اثرات دکھائے گئے ہیں، اس سلسلہ میں عربی و فارسی کے متعدد ایسے الفاظ نقل کئے گئے ہیں جن کے اردو میں تغیر و تبدل کے بعد معنی و مفہوم مختلف ہو گئے ہیں، مصنف نے اس کی خاص طور پر تردید کی ہے کہ اردو صرف مسلمانوں کی زبان ہے اور ہندوؤں کے اردو زبان و ادب کے خدمات تفصیل سے تحریر کئے ہیں، اور شعر و ادب، تاریخ و سیاست، صحافت و خطابت اور دوسرے فنون جغرافیہ، سائنس، ریاضی، منطق و فلسفہ اور ہیئت وغیرہ میں، ان کے مساعی بیان کئے ہیں، مصنف نے ہندو ادیبوں

شاعروں مقرروں مصنفوں اور محسنین اردو کی، اتنی طویل فہرست دی ہے، کہ مشکل ہی سے کسی ممتاز ہند و اہل قلم کا نام رہ گیا ہوگا۔ اور سب کے کلام، تحریر اور تقریر کے نمونے اور تصنیفات کے نام بھی دئے ہیں۔ ابتداء میں جنوبی ہند میں اردو کے درجہ و مقام کا ذکر ہے۔ مگر کتاب میں ترتیب اور تصنیفی شان کی کمی، تحریر میں الجھاؤ اور جابجا تکرار پایا جاتا ہے ان خامیوں کے باوجود مصنّف کی محنت قابل داد ہے اور کتاب مفید ہے۔

گلدستۂ آل انڈیا مشاعرہ بیادگار مرزا احسان احمد مرحوم - مرتبہ۔ جناب شفقت علاء الدین صاحب متوسط تقطیع عمدہ آرٹ پیپر صفحات ۱۰۰ قیمت عـه پتہ احسان پبلشنگ ہاؤس کرمی ٹولہ اعظم گڈھ۔

ہمارے ضلع کے مشہور اور کامیاب وکیل مرزا احسان احمد مرحوم کو شعر و سخن کا بڑا ستھرا اور عمدہ ذوق تھا۔ ان کے کلام اور ادبی و تنقیدی مضامین کے مجموعے چھپ چکے ہیں۔ مئی ۶۳ء میں شبلی کالج میں ان کی یادگار میں ایک عظیم الشان آل انڈیا مشاعرہ ہوا تھا۔ جو مرزا صاحب کے بھتیجے شفقت علاؤالدین صاحب کی محنت اور کوشش سے بڑا کامیاب رہا، اب انھوں نے اپنے عم محترم کی یادگار میں یہ سونیر شائع کیا ہے، اس میں ان سب شاعروں کا کلام محفوظ کر دیا ہے، جو مشاعرہ میں شریک تھے، مرزا صاحب کے غیر مطبوعہ کلام کا بھی کچھ حصہ اور دار المصنفین کے اکابر اور شبلی کالج کے ذمہ داروں کا خراج عقیدت بھی اس میں آگیا ہے۔ دو مضامین انکی سیرت و شخصیت اور شعری و ادبی کمالات پر ہیں، ابتداء میں صدر و نائب صدر جمہوریہ، بعض مرکزی وزیروں اور مشاہیر کے علاوہ اتر پردیش کے موجودہ گورنر عالی جناب اکبر علی خان صاحب کے تہنیتی پیغامات اور خطوط درج ہیں، اور مشاعرہ کے کنوینر شفقت علاؤالدین صاحب نے اسکی دلچسپ روداد تحریر کی ہے، سونیر کی

ظاہری نفاست و آرائش اور کاغذ کتابت و طباعت ہر ہر چیز سے مرتب کی خوش سلیقگی ظاہر ہوتی ہے۔ لیکن اشتہارات کی زیادتی ارباب ذوق کی طبیعت پر گران گذرتی ہے، جو مرزا صاحب مرحوم جیسے سنجیدگی اور سادگی پسند شخص کی روح کے لئے بھی کہیں باعث ملال نہ ہو۔ امید ہو کہ مرزا صاحب کے کلام کا زیر طبع مجموعہ جو یہ ترتیب دیرہے ہیں اس سے خالی ہوگا،

چند مشاہیر - مرتبہ۔ جناب عبد الاحد معظم آبادی تقطیع خورد، کاغذ کتابت و طباعت بہتر صفحات ۹۶۔ قیمت - ۶ر پتہ :- اعجاز ہوٹل، جامع مسجد اردو بازار گورکھ پور،

یہ ہند و بیرون ہند کے انیس[۱۹] مشاہیر کا مختصر تذکرہ ہے۔ اس میں علم و ادب، سیاست و قانون اور سائنس وغیرہ مختلف فنون کے نامور فضلاء کے مختصر حالات و کمالات تحریر کئے گئے ہیں۔ ہندوستان کے مسلم مشاہیر میں مولانا محمد علی، راشد الخیری، ڈاکٹر انصاری، عارف ہنسوی، آغا حشر، سر فضل حسین سر شاہ سلیمان، سر راس مسعود، اور سر سید علی امام اور غیر مسلموں میں ڈاکٹر جیسوال، منشی پریم چند اور سر جگدیش چندر بوس کے واقعات اور ان حضرات کے اپنے اپنے امتیازی دائروں کے علاوہ علم و فن اور زندگی کے دوسرے مختلف شعبوں میں خدمات اور کارنامے بیان کئے گئے ہیں۔ ان کے علاوہ یورپ کے کچھ فضلا کا مختصر تذکرہ بھی ہے، اکابر کے حالات و واقعات زندگی دلچسپ اور سبق آموز ہوتے ہیں اس لئے اس کتابچہ کا مطالعہ دلچسپی اور فائدہ سے خالی نہیں ہے،

گورونانک جی مہاراج مشہور بابا نانک شاہ، مرتبہ۔ قاری محمد بشیر الدین صاحب پنڈت، تقطیع خورد کاغذ معمولی، کتابت و طباعت اچھی

صفحات ۸۰ ... قیمت تحریر نہیں، پتے۔ (۱) سنٹرل جمعیۃ تبلیغ الاسلام ۹۸/۴۷ ناظر باغ کانپور، (۲) فریدی بلڈنگ، سنبھلی گیٹ، مراد آباد،

یہ سکھوں کے مشہور مذہبی رہنما گورو نانک جی کے حالات و تعلیمات کا مختصر خاکہ ہے، پہلے ان کی تعلیم و تربیت سیر و سیاحت اور ان پر مسلمان صوفیوں کے اثرات وغیرہ کا ذکر ہے۔ اور آخر میں ان کی ہدایات و تعلیمات نام (حقوق اللہ) دان (حقوق العباد) اشنان (جان و تن کے حقوق) اور دوسرے خیالات کی تشریح و وضاحت کی گئی ہے۔ مصنف نے دکھایا ہے کہ گورو جی ہندوستان کے تمام فرقوں میں اتحاد و یکجہتی پیدا کرنا چاہتے تھے۔ اور ان کی تعلیمات اسلامی رنگ میں رنگی ہوئی تھیں۔ اور گورو گرنتھ صاحب کے شلوکوں (شعروں) میں توحید و رسالت اور آخرت پر ایمان لانے کی تلقین کی گئی ہے۔ اس کتاب میں گورو جی مہاراج کی اصل تعلیمات پیش کر کے ان کے پیروؤں اور سکھ حضرات کو ان پر غور و فکر کرنے کی دعوت دی گئی ہے۔

شعاعوں کی صلیب مرتبہ جناب کرامت علی کرامت صاحب تقطیع خورد کاغذ کتابت و طباعت عمدہ صفحات ۹۴ مجلد قیمت ۶ روپے پتہ شاخسار پبلیشر بخشی بازار، کٹک ۱

جناب کرامت علی کرامت کا وطن اڑیسہ ہے وہ وہاں کے ایک کالج میں ریاضی کے استاد ہیں لیکن اسکے باوجود انکو اردو شعر و ادب کا اچھا ذوق ہے، اڑیسہ سے شائع ہونے والا دو ماہی شاخسار ان ہی کی ادارت میں چھپتا ہے، اسمیں اور دوسرے ادبی رسائل میں انکا کلام اور ادبی و تنقیدی مضامین چھپتے رہتے ہیں "شعاعوں کی صلیب" انکا پہلا مجموعہ کلام اور نظموں و غزلوں پر مشتمل ہے، کرامت صاحب کا کلام غور و تامل کا نتیجہ اور سطحیت و رکاکت سے خالی ہے امید ہے کہ جدید شاعری کے قدردانوں میں یہ مجموعہ کلام مقبول ہوگا، شروع میں انھوں نے اپنے حالات اور شاعری کے متعلق معلومات بھی تحریر کئے ہیں۔

"ض"

جلد ۱۳ ماہ ربیع الثانی ۱۳۹۴ھ مطابق ماہ مئی ۱۹۷۴ء نمبر ۵

مضامین

مقالات

بزم صوفیہ